مفید صنف بن سکتے ہیں، اب نئے شعرا میں اس کا رجحان ہو چلا ہے، جمال کربلا اسی قسم کے اصلاحی اور سبق آموز سلاموں کا مجموعہ ہے، اس میں واقعۂ کربلا کے سبق آموز اخلاقی پہلوؤں کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے اور وہ سوز و درد سے بھی خالی نہیں ہیں، اسطرح یہ سلام دو آتشہ ہو گئے ہیں، اور مرثیہ گو شعراء کے لیے لائق تقلید ہیں، مصنف ابھی نوجوان ہیں، لیکن انکا کلام اسقامِ شاعری سے پاک ہے، اس مجموعہ کے شروع میں جناب اعجاز صدیقی اڈیٹر شاعر اور حبیب الرحمن صاحب غزنوی اڈیٹر آب حیات کے قلم سے سلاموں پر تبصرہ ہے۔

آسان ریاضی حصہ پنجم — مرتبہ شوکت علی صاحب بی اے، بی، ٹی، ایل ٹی، تقطیع اوسط، ضخامت ۱۹۲ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ پتہ: مکتبہ جماعت اسلامی، رامپور۔

جماعت اسلامی نے اردو میں جدید تعلیم کا پورا نصاب مرتب کر دیا ہے، یہ ریاضی کی کتاب کا پانچواں حصہ ہے، یہ پورا سلسلہ ماہرین تعلیم کا مرتب کیا ہوا ہے، اس لیے تعلیمی حیثیت سے معیاری ہے، اس زمانہ میں جبکہ اردو زبان ہی ختم کی جا رہی ہے، اردو میں ایسی کتابوں کی تالیف و اشاعت تعلیم کیساتھ ساتھ اردو زبان کی بھی خدمت ہے، اس سے معلمین اور متعلمین دونوں کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔

الخیر الکثیر — شاہ ولی اللہ صاحب، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰۴ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، بلکہ خراب، قیمت عہ۔ پتہ: دائرہ الہلال بنارس۔

الخیر الکثیر شاہ ولی اللہ صاحب کی مشہور تصنیف ہے، جو عرصہ سے نایاب تھی، اس لیے ادارۂ الہلال نے اس کو شائع کیا ہے، مولوی بشیر احمد صاحب نے اس کی تصحیح کی ہے، پھر بھی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں، اگرچہ اس کی طباعت نہایت خراب ہے، لیکن یہ کتاب کمیاب بلکہ نایاب تھی، اس لیے یہ بھی غنیمت ہے۔

"م"

نمبر ۴ ماہ ربیع الاول ۱۳۷۶ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۵۷ء جلد ۸۱

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحات
شذرات	شاہ معین الدین ندوی	۲۴۲-۲۴۴
مقالات		
کیا متفقہ اسلامی احکام کو بھی اجتہاد سے بدلا جا سکتا ہے	جناب مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین	۲۴۵-۲۶۸
حکیم ازرقی	از ڈاکٹر غلام مصطفی خاں صاحب ایم اے، ایل ایل بی صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی	۲۶۹-۲۸۰
اقبال کا فوق البشر	از جناب مرزا صفدر علی صاحب لکچرار ورنگل کالج، جامعہ عثمانیہ	۲۸۱-۲۹۳
افریقہ اور اسلام	جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب پروفیسر عربی پنجاب یونیورسٹی	۲۹۴-۳۰۴
آثار تاریخیہ		
مکتوب مولانا شوکت علی مرحوم بنام مولانا مسعود علی صاحب ندوی		۳۰۵-۳۱۴
ادبیات		
نسیم دیار نبی زندہ باشی	از جناب زائر حرم حمید صدیقی	۳۱۵-۳۱۶
شمع جہانے سید و سرور صلی اللہ علیہ وسلم	از جناب سید ظہور الحسن صاحب شارب ایم اے ایل ایل بی پی ایچ ڈی ایڈوکیٹ ہائیکورٹ	۳۱۶
مطبوعات جدیدہ	"م"	۳۱۷-۳۲۰

شذرات

افراد کی طرح اقوام کی موت و حیات، ضعف و قوت اور ترقی و تنزل کے کچھ اصول و قوانین ہیں، جن پر ان کی موت اور زندگی کا مدار ہے، ان اصولوں کو اجتماعی اخلاق عالیہ اور سیرت و کردار کی بلندی سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے، جو قوم بھی ان اصولوں پر عامل اور ان اوصاف سے متصف ہوگی، وہ دنیا میں کامیاب اور سربلند ہوگی اور جو ان سے عاری ہوگی وہ تنزل اور پستی کا شکار ہوگی، مثلاً نصب العین کی وحدت اس کے حصول کے لیے ان تھک جد و جہد محنت کوشی و جگر کاوی، اخلاص و صداقت، ایثار و قربانی، اتحاد و یکجہتی، قومی ہمدردی و مواسات، عدل و مساوات، ضبط و نظم کے اوصاف سے جو قوم بھی آراستہ ہوگی، وہ ضرور بام عروج پر پہنچے گی، اور جو پریشان خیالی، خود غرضی، ذاتی منفعت، تن آسانی و عیش پرستی، نفاق و شقاق ملت فروشی ظلم و زیادتی، لاقانونیت اور بدنظمی میں مبتلا ہوگی، اس کو کوئی قوت تباہی سے نہیں بچا سکتی، اس میں مومن و کافر کی کوئی تفریق نہیں، مغربی قوموں کی ترقی کا راز یہی ہے، کہ وہ زندگی کے اصولوں پر عامل ہیں، ان کا اجتماعی اخلاق اور قومی کردار بہت بلند ہے، اس لیے وہ بہت سے اخلاقی عیوب کے باوجود دنیا میں کامیاب اور سربلند ہیں۔

درحقیقت اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے قوانین الگ الگ بنائے ہیں، جن کا اثر ایک دوسرے پر نہیں پڑتا، مثلاً حصول کمال کے لیے محنت و جانکاہی شرط ہے، جو شخص بھی اس سے کام لے گا

خواہ اس میں دوسری خرابیاں ہوں مگر اس مقصد میں ضرور کامیاب ہوگا، یہ اور بات ہے کہ اس کی برائیوں کی بھی اس کو سزا ملے، یہی حال زندگی کے سارے اعمال کا ہے، جس کام کے لیے جو شرط ہے اس کو جو بھی پورا کرے گا، اس میں وہ کامیاب ہوگا،

اسلام دین و دنیا دونوں کا جامع ہے، بلکہ اس میں دنیا بھی دین ہی کا ایک شعبہ ہے، اور دنیاوی فرائض کی ادائیگی کے بغیر دین مکمل نہیں ہوتا، اور انکی ادائیگی دین ہی کے حکم کی تعمیل ہے، اس حیثیت سے اسلام میں دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں، چنانچہ دنیاوی فلاح و سعادت اور قوم و ملت کی مادی ترقی کے جو احکام و تعلیمات ہیں، ان کی وہی اہمیت ہے جو خالص دینی احکام کی ہے، مسلمانوں کے تنزل کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے دین و دنیا میں تفریق کردی اور دین کو عقائد و عبادات میں محدود کر کے دنیاوی معاملات کو ان سے خارج کر دیا، حالانکہ جس طرح عبادات فرض ہیں، اسی طرح قوم و ملت کی شوکت و عظمت کے لیے ہر قسم کی جد و جہد اور دنیاوی تدابیر بھی فرض ہیں، چنانچہ جہاد افضل العبادات ہے، مگر مسلمانوں نے دنیاوی جد و جہد کو بالکل فراموش کر دیا، اس کے مقابلہ میں دوسری قوموں نے جن کے یہاں اس کی حیثیت محض ایک مادی تدبیر کی ہے، اسکو زندگی کا لائحہ عمل بنا لیا، اور وہ اسکی طبیعت ثانیہ بن گئے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ قومیں جن کو مسلمان ملحد اور بے دین کہتے ہیں، دنیاوی ترقی کے اوج کمال پر پہنچ گئیں، اور خود مسلمان جو اپنے کو خیر الامم سمجھتے ہیں، تنزل و پستی میں مبتلا ہیں۔ "مسلم آئین ہوا کافر تو ملے حور و قصور" کا یہی مطلب ہے۔

چونکہ اسلام میں دین و دنیا الگ الگ نہیں ہیں، اس لیے جب دین کا سررشتہ مسلمانوں کے ہاتھ سے چھوٹا تو اس کے ایک اہم شعبہ یعنی دنیا میں زندہ رہنے کے اصولوں، اسکی مادی تدبیروں اور اجتماعی اخلاق عالیہ

کا سبق بھی وہ بھول گئے جس کا نتیجہ نکبت و فلاکت ہے، آج دنیا میں مسلمانوں کی تعداد پچاس کروڑ کے قریب ہے، انکی حکومتیں ایشیا اور افریقہ کے ہر حصہ میں موجود ہیں، یورپ بھی ان سے خالی نہیں ہے، ان کی جغرافی پوزیشن یہ ہے کہ مغرب میں ترکی و ایران سے لیکر جبرالٹر تک اور مشرق بعید میں ملایا اور انڈونیشیا تک پھیلی ہوئی ہیں، شمالی افریقہ کا، بحر روم کا پورا ساحل ان کے قبضہ میں ہے، اور یورپ اور ایشیا و افریقہ کے درمیان ان کی حیثیت پاسبان کی ہے، مگر اس اہمیت کے باوجود بین الاقوامی دنیا میں انکا کوئی وزن نہیں، بیشتر حکومتیں مغربی طاقتوں کا ضمیمہ یا کم سے کم انکے سیاسی اور معاشی دام میں گرفتار ہیں، اور دو چار کے سوا اکثر حکومتوں میں وہ ساری خرابیاں موجود ہیں جو قوموں کے لیے پیام موت ہیں، اس کا مشاہدہ ہمارے پڑوس کی اسلامی حکومت میں کیا جا سکتا ہے۔

جو حکومتیں ترقی یافتہ بھی کہلاتی ہیں، ان میں بھی مغربی قوموں کے ظواہر کی نقالی زیادہ ہے، انکے قومی و اجتماعی کردار اور زندگی کی حرارت اور تڑپ سے انکو بہت کم علاقہ ہے جس کے بغیر دنیاوی ترقی بھی ممکن نہیں ہے، مسلمانوں کے لیے اس کا سب سے بڑا سرچشمہ مذہب ہے کہ وہی اس کا سب سے بڑا معلم ہے، اور اس کے بغیر انکی حقیقی ترقی کا تصور نہیں کیا جا سکتا مگر افسوس تو اس کا ہے کہ انھوں نے دنیاوی اور مادی ترقی کے اسلامی اصولوں کو بھی فراموش کر دیا، ورنہ کم سے کم دنیا ہی انکو حاصل ہو جاتی اور وہ خسر الدنیا والآخرہ کے مصداق نہ بنتے، امید یہ صورت اس وقت تک قائم رہے گی جبتک مذہب کے دونوں یا کم سے کم ایک پہلو پر ان کا عمل نہ ہوگا۔

گورنمنٹ آف انڈیا کا لاکمیشن مذہبی اوقاف کے مسئلہ پر بھی غور کر رہا ہے، اور اسکا اندیشہ ہے کہ اسلامی اوقاف کو بھی عام اوقاف میں شامل کر لیا جائے، اسلامی اوقاف کی حیثیت خالص مذہبی ہے، اس میں نہ کسی قسم کا تغیر کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کو دوسرے اوقاف میں شامل کیا جا سکتا ہے، اسلیے امید ہے کہ لاکمیشن انکی اس حیثیت کا لحاظ رکھے گا اور اس میں کوئی ایسی مداخلت نہ کریگا جس سے انکی مذہبی حیثیت پر اثر پڑے۔

مقالات

کیا متفقہ اسلامی احکام کو اجتہاد کے ذریعہ بدلا جا سکتا ہے؟

از مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین

(۶)

تجارتی گھوڑوں کی زکوٰۃ اس مسئلہ کے سلسلہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں اونٹ، بکری اور دوسرے حلال جانوروں کے پالنے والوں سے ان کی زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی، لیکن گھوڑوں کے پالنے پر کوئی زکوٰۃ نہیں لی جاتی تھی، بلکہ آپ کے ایک ارشاد سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے حکماً اس سے منع فرما دیا ہے، لیکن حضرت عمرؓ نے اس اسوہ اور ارشاد نبوی کے باوجود اپنے اجتہاد سے گھوڑوں پر ایک دینار سالانہ کے حساب سے زکوٰۃ عائد کی۔

اس مسئلہ کی تفصیل سے پہلے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جزیرۂ عرب میں گھوڑوں کے پالنے کا رواج بھی تھا، اور یہ بڑی عزت کی چیز بھی سمجھی جاتی تھی لیکن یہ صرف جنگی ضرورتوں یا سفر کی سہولت کے لیے پالے جاتے تھے، اونٹ، بکری اور دوسرے جانوروں کی طرح افزائش نسل، تجارت یا لباس اور غذائی ضرورتوں کے لیے ان کے پالے جانے کا رواج نہیں تھا، اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اونٹ یا بکری وغیرہ کے پالنے میں ان کو نگرانی کے علاوہ اور کوئی خاص زحمت اٹھانی نہیں پڑتی تھی، نہ تو ان کے چارہ کے لیے کوئی

اہتمام کرنا پڑتا تھا، اور نہ رہایش کے لیے مکان فراہم کرنے کی ضرورت تھی، بلکہ "وادی غیر ذی زرع" کے کھلے ہوئے میدان ان کے لیے چارہ اور رہایش گاہ دونوں کا کام دیتے تھے، یہی وجہ تھی کہ عربوں کی عام آبادی نہ تو ان جانوروں کے پالنے میں کوئی دقت محسوس کرتی تھی اور نہ ان کی خرید و فروخت میں، برخلاف اس کے گھوڑوں کے خریدنے میں ایک بڑی رقم کی بھی ضرورت ہوتی تھی، اور ان کے لیے اچھی غذا اور رہایش کے لیے مکان کی بھی ضرورت تھی، ظاہر ہے کہ جزیرۂ عرب کی عام انسانی آبادی خود ان نعمتوں سے محروم تھی، وہ گھوڑوں کے لیے کہاں سے یہ چیزیں فراہم کرسکتی تھی، جبکہ ان کے ذریعہ ان کی کوئی بنیادی ضرورت بھی پوری نہیں ہوتی تھی، اسلیے گھوڑوں کے پالنے کا رواج وہاں صرف خوش حال طبقہ ہی میں تھا، جو پوری آبادی کا مشکل سے سواں حصہ تھا، گو عربی نسل کے گھوڑے پوری دنیا میں مشہور تھے، مگر یہ عربوں کے مقابلہ میں ایرانیوں اور رومیوں کے پاس زیادہ پائے جاتے تھے[۱]، کیونکہ وہ عربوں کے مقابلہ میں زیادہ خوش حال بھی تھے، اور زرخیز علاقہ ہونے کی وجہ سے ان کی پرورش اور غور و پرداخت کا سامان بھی انکو ہر طرف فراوانی سے مل جاتا تھا، چنانچہ مسلمانوں سے ان کی جتنی لڑائیاں ہوئیں ان میں دوسرے اسلحوں کے ساتھ گھوڑوں کی بھی ریل پیل ہوتی تھی، وہاں گھوڑے صرف جنگی ضرورتوں ہی کے لیے نہیں بلکہ افزایش نسل اور تجارت کی غرض سے بھی پالے جاتے تھے، چنانچہ حضرت فاروق رضؓ کے زمانہ میں جب یہ علاقے مکمل طور پر فتح ہوئے تو ایک نیا مسئلہ ان کے سامنے آیا، کہ جس طرح اونٹ، بکری اور دوسرے سائمہ جانور جب تجارت یا نسل بڑھانے کیلیے پالے جاتے ہیں تو ان کی زکوٰۃ لیجاتی ہے، تو گھوڑے جو ان ہی مقاصد کے تحت ان علاقوں میں

---

[۱] عربی نسل کے گھوڑوں کے علاوہ بھی بعض اچھی نسل کے گھوڑے ایرانیوں کے پاس ہوتے تھے، جنکو وہ برذون کہا کرتے تھے، بعض لوگ اسکو ایرانی نژاد کہتے ہیں، اور بعض ترکی نژاد، بعض حیثیتوں سے انکو عربی گھوڑوں پر بھی ترجیح دیجاتی تھی۔

پالے جاتے ہیں تو ان کی زکوٰۃ بھی لیجائے یا نہیں؟ چنانچہ حضرت عمرؓ نے صحابہ کے سامنے اس مسئلہ کو پیش کیا، اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ ان کے مالکوں سے زکوٰۃ واجبہ تو نہیں لیجاسکتی، لیکن بطور صدقہ ایک دینار یا دس درہم سالانہ فی راس وصول کیا جائے، یہ فیصلہ ان حضرات نے اس لیے کیا کہ جن وجوہ کی بناپر دوسرے جانوروں پر زکوٰۃ عائد کی گئی تھی، قریب قریب وہ تمام وجوہ یہاں بھی پائے جاتے تھے، اس لیے ان پر بھی بطور صدقہ ایک رقم لگا دی گئی، لیکن اس کو زکوٰۃ واجبہ اس لیے قرار نہیں دیا گیا کہ عہد نبوی میں اس کی نہ تو کوئی مثال موجود تھی، اور نہ تو صراحۃً آپ نے ان کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم فرمایا تھا،

غرض یہ کہ عہد نبوی ﷺ میں گھوڑوں پر زکوٰۃ عائد کرنے کا کوئی سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوا، اس لیے ان کے بارے میں آپ نے صراحۃً کوئی حکم صادر نہیں فرمایا تھا، اور جب یہ سوال پیدا ہوا تو چونکہ آپ کے کسی ارشاد سے صراحۃً اس کی ممانعت ثابت نہیں تھی، بلکہ بعض ارشادات سے اشارۃً یہ پتہ چلتا تھا کہ اس کی گنجایش ہے، اور قیاساً بھی ان پر صدقہ عائد کرنے کی گنجایش نکلتی تھی، اس لیے ایسا کیا گیا،

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو پھر اُس ارشاد نبوی کا کیا مطلب ہوگا جسمیں آپ نے صراحۃً فرمایا ہے:

لیس علی المسلم فی عبدہ	نہ تو مسلمان غلام پر صدقہ ہے اور نہ
ولا فی فرسہ صدقۃ	اس کے گھوڑے پر،

یہ ارشاد نبوی ان غلاموں اور گھوڑوں سے متعلق ہے جو آدمی اپنی ذاتی سواری یا خدمت کے لیے رکھتا ہے، چنانچہ غلام یعنی خدمت گار کے ساتھ ہی اس کا تذکرہ کیا گیا ہے، اگر آپ کو گھوڑوں کی زکوٰۃ سے صراحۃً روکنا ہوتا تو آپ فی فرسہ یعنی ہ کی ضمیر کے بجائے

مطلق لفظ ولا فی ظہورہا فرماتے۔

پھر یہ ارشاد اس لیے بھی اسی معنی پر محمول کیا جائے گا کہ آپ کے عہد میں جن مسلمانوں کے پاس گھوڑے تھے وہ محض ذاتی استعمال ہی کے لیے تھے۔ اس کے برخلاف دوسرے ارشادات نبوی سے صراحۃً تو نہیں مگر اشارۃً یہ پتہ چلتا ہے کہ اگر یہ تجارت یا نسل بڑھانے کی غرض سے رکھے جائیں تو ان کا صدقہ لیا جاسکتا ہے، آپ نے ایک بار فرمایا کہ گھوڑوں کے پالنے کا نتیجہ تین طرح سے ظاہر ہوتا ہے؛ ایک آدمی کے لیے تو ان کا پالنا اجر و ثواب کا سبب ہوتا ہے، دوسرے کے لیے وہ عذاب و عتاب کا سبب ہوتے ہیں، اور تیسرے کی عزت و آبرو کی پردہ پوشی ان سے ہوتی ہے یعنی وہ شخص جو کسی دینی مقصد یعنی جہاد وغیرہ کے لیے نہیں پالتا، صرف اپنی زینت و عزت افزائی کے لیے پالتا ہے، ایسے شخص کو گھوڑا پالنے کی اجازت تو ہے لیکن جب وہ

لم ینس حق اللہ فی رقابہا	خدا کا وہ حق جو ان کی گردنوں اور
ولا فی ظہورہا[1]	پیٹھوں سے متعلق ہے، نہ بھولے۔

معلوم یہ ہوا کہ جو گھوڑے خدا کے دین کی خدمت ہی کے لیے پالے جائیں تو ان کا پالنا سراسر اجر و ثواب ہے، اور جو اس کے خلاف مقصد پالے جائیں، وہ سراسر عذاب و عتاب کا سبب ہیں، لیکن جو نہ تو کسی خالص دینی مقصد کے لیے پالے جائیں اور نہ غیر دینی مقصد کے لیے بلکہ صرف مادی زینت و آرایش یا مادی فائدے کے لیے پالے جائیں تو وہ ان کے لیے پردہ پوش اس وقت ہو سکتے ہیں.................. جب ان کی گردن اور پیٹھ کا حق ادا کردیا جائے، پیٹھ کا حق تو ظاہر ہے کہ اس پر سوار ہو کر جہاد کیا جائے اور گردن کا حق اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے اوپر صدقہ جاری کیا جائے، کوئی مالی یا

[1] معانی الآثار ج ۱ ص ۳۱۱

غیر مادی ذمہ داری ڈالنے کے موقع پر رقبہ یا رقاب کا لفظ عموماً استعمال کیا جاتا ہے۔

اوپر اس مسئلہ کی جو تفصیل کی گئی ہے، اس سے یہ بات غالباً واضح ہوگئی ہوگی کہ حضرت عمرؓ نے نہ تو عہد نبوی اور عہد صدیقی کے تعامل کے خلاف کوئی فیصلہ کیا اور نہ ارشاد نبوی کے خلاف بلکہ ان کا فیصلہ بالکل ایک نئی صورت سے متعلق تھا، اگر کوئی یہ ثابت کردے کہ عہد نبوی میں تجارت اور افزائش نسل کے لیے گھوڑے پالتے جاتے رہے ہوں اور پھر بھی آپ نے ان کی زکوٰۃ نہ لی ہو یا اس سے صراحۃً منع فرمایا ہو تو البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عہد نبوی اور عہد صدیقی کے تعامل کے خلاف کوئی فیصلہ کیا، لیکن جب یہ بات ثابت نہیں ہے تو اس کو خلاف سنت نبوی کہنا کم سوادی اور علمی کم مائگی کے علاوہ اور کیا ہو، یہ اور بات ہے کہ حضرت عمرؓ کے استدلال کو قیاسی طور پر قابل ترجیح قرار نہ دے کر اس کو واجب نہ قرار دیا جائے، لیکن خلاف سنت کہنا انتہائی جرأت کی بات ہے۔

اب مختصراً وہ تفصیل بھی ملاحظہ کر لیجیے، جو گھوڑوں پر صدقہ مقرر کرنے سے متعلق حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے۔

حارثہ بن مضرب بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کے ساتھ حج میں شریک تھا، آپ کی خدمت میں شام کے کچھ معززین آئے اور عرض کیا کہ اے امیرالمومنین ہمارے پاس بہت سے گھوڑے، دوسرے جانور اور غلام وغیرہ ہیں، آپ ان کا صدقہ لیکر ہم کو پاک کردیجیے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیقؓ نے تو گھوڑے اور غلام پر کوئی صدقہ نہیں لیا مگر ذرا ٹھہرو میں اہل رائے مسلمانوں سے مشورہ کرلوں، چنانچہ آپ نے متعدد صحابہ سے مشورہ کیا، تو سب نے صدقہ وصول کرنے کی رائے دی، مگر حضرت علیؓ اب تک خاموش تھے، حضرت فاروقؓ نے ان کی رائے معلوم کی تو انھوں نے بھی عام

صحابہ کی رائے کی تائید کی، مگر اس میں یہ شرط لگا دی کہ

ان لا یکون امراً واجباً ولا جزیة	یہ نہ ان پر فرض قرار دیا جائے اور نہ اسکو مقررہ
لازمة یوخذون بھا	ٹیکس سمجھا جائے کہ لامحالہ اسے وصول ہی کیا جائے [1]

چنانچہ اس کے بعد عمدہ گھوڑوں پر دس درہم سالانہ اور ہجین پر آٹھ اور بزون وغیرہ پر پانچ درہم سالانہ زکوٰۃ مقرر کی گئی۔ [1]

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد امام طحاوی لکھتے ہیں:

حضرت عمرؓ نے گھوڑوں پر جو صدقہ عائد کیا تھا وہ زکوٰۃ واجبہ کے علاوہ ایک صدقہ تھا، چنانچہ حضرت علیؓ نے اس طرف اشارہ بھی کر دیا تھا کہ یہ ان پر بطور فرض عاید نہیں کیا جا سکتا، یعنی بطور واجب فرض تو اس کو زکوٰۃ اسی وقت قرار دیا جا سکتا تھا جب کتاب یا سنت یا دونوں سے صراحۃً یہ ثابت ہوتا،

ان تمام تفصیلات سے معلوم ہو گیا کہ یہ ایک بالکل ہی نئی صورت تھی جس میں صدقہ عائد کیا گیا اور اسی پر کیا اگر کسی ملک میں کوئی بالکل نیا حلال جانور تجارت اور افزائش نسل کے لیے پالا جانے لگے تو اس پر بھی زکوٰۃ لی جائے گی، لیکن چونکہ اس بارے میں کوئی اسوۂ نبوی یا ارشادِ نبوی موجود نہیں تھا، اس لیے حضرت عمرؓ نے صحابہ کے مشورہ سے احتیاطاً اس کو زکوٰۃ واجبہ [2] قرار نہیں دیا، بلکہ بطور صدقہ یا بطور ٹیکس کچھ رقم ان پر عائد کی، اگرچہ ایسے گھوڑوں پر زکوٰۃ واجبہ بھی قرار دیدی جاتی تو یہ بھی کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ کے منشا کے خلاف نہ ہوتا، کیونکہ تجارتی اموال اور تمام سائمہ جانوروں پر زکوٰۃ کا وجوب کتاب و سنت سے ثابت ہے۔

---

[1] معانی الآثار ج ۱ ص ۳۱۱ [2] زکوٰۃ واجبہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی اور نہ دینے والوں کے خلاف جنگ تک کی جا سکتی ہے، جیسا کہ مانعین زکوٰۃ کے سلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ نے کیا تھا،

آپ کے مذکورۂ بالا ارشاد سے اشارۃً گھوڑوں پر زکوٰۃ کا وجوب بھی ثابت ہوتا ہے، مگر اس کے باوجود حضرت عمرؓ نے انتہائی محتاط صورت اختیار فرمائی، پھر بھی یہ کہنا کتنی جرأت کی بات ہے کہ آپ نے سنت نبوی کے خلاف کوئی فیصلہ فرمایا،

امہات الاولاد کی خرید و فروخت

وہ لونڈیاں جن کے بچے ہو جاتے ہیں ان کو ام ولد کہتے ہیں، اس ام ولد کی جمع امہات الاولاد ہے، اس بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ عہد نبوی میں ان کی خرید و فروخت کی اجازت تھی لیکن حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کے مشورہ سے ان کی خرید و فروخت موقوف کر دی اور ان کو آزاد عورتوں کا مرتبہ دے دیا،

اس سلسلہ میں اگر ان احکام ہی کو سامنے رکھا جائے جو کتاب و سنت میں غلاموں کی آزادی، ان کی عزت افزائی اور معاشرہ میں ان کو آزاد انسانوں کے مساوی مرتبہ عطا کرنے کے سلسلہ میں دیے گئے ہیں تو بھی حضرت عمرؓ کا یہ طرز عمل کتاب و سنت کے منشا کے خلاف نظر آئے گا، لیکن ان احکام کے علاوہ دوسرے قوی نقلی دلائل بھی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے کوئی نیا فیصلہ نہیں کیا، بلکہ ایک حکم یا منشائے نبوی کو حکماً و قانوناً نافذ کر دیا، اسی نفاذ کی وجہ سے محدثین و مورخین اس کو اولیات عمر میں داخل کرتے ہیں، اس مسئلہ کی تفصیل ملاحظہ ہو،

غالباً ۶ھ میں مقوقس شاہ مصر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو کنیزیں بھیجی تھیں، جن میں ایک کا نام حضرت ماریہ قبطیہ تھا جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خدمت میں رکھ لیا، ان ہی کے بطن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم پیدا ہوئے تھے، ان کی پیدائش کے بعد ایک بار صحابہ کے سامنے حضرت ماریہؓ کا ذکر آیا تو آپ نے فرمایا، اب وہ لونڈی نہیں ہیں، بلکہ ان کی حیثیت ایک آزاد عورت کی ہے،

اعتقھا ولدھا	ان کے بچے نے انھیں آزاد کر دیا،

چنانچہ تمام ازواج مطہرات کی طرح وہ بھی پردہ میں رہتی تھیں، اور ان کا نان نفقہ آپ ہی برداشت فرماتے تھے۔

اس ارشاد نبوی سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ اگر کسی لونڈی کو اس کے آقا کے صلب سے کوئی بچہ پیدا ہو جائے تو اس کی حیثیت لونڈی اور کنیز کی نہیں بلکہ ایک آزاد عورت کی ہو جاتی ہے، اب اس پر بھی وہ تمام احکام جاری ہوں گے۔ اور اس کو وہ تمام حقوق ملیں گے جو ایک آزاد عورت پر جاری ہوتے اور اس کو ملتے ہیں، ان ہی احکام اور حقوق میں ایک حکم اور حق یہ بھی ہے کہ جس طرح کسی آزاد عورت کو بیچا اور خریدا نہیں جا سکتا، اسی طرح اس کی بیع و شرا بھی نہیں کی جا سکتی۔

آپ نے ایک دوسرے ارشاد میں فرمایا ہے کہ "بچوں کو ان کی ماؤں سے جدا نہ کیا جائے"، ظاہر ہے کہ اگر ان کی خرید و فروخت ہو گی تو لامحالہ ماں اور اس کے بچے کے درمیان تفریق ہو گی، کیونکہ خریدنے والا بھی ماں کے ساتھ بچے کی پرورش کا بار اٹھانے میں تامل کرے گا، اور بیچنے والا بھی اپنی اولاد کو بیچنے پر مشکل سے راضی ہو گا، ایسی صورت میں دونوں میں تفریق لازم آئیگی،

اس سے بھی زیادہ واضح آپ کا وہ ارشاد ہے جس میں آپ نے صراحۃً ام ولد کی آزادی کا اعلان فرمایا ہے، آپ نے فرمایا:

ایما امة ولدت من سیدها	جس لونڈی کو اس کے آقا کے صلب سے بچہ پیدا
فهی حرة اذا مات الا ان یعتقها	ہو جائے وہ اس کے مرنے کے بعد آزاد ہے،
قبل موته [1]	اگر وہ اپنی زندگی ہی میں اسے آزاد کر دے
	تو اسی وقت آزاد ہو جائے گی۔

---

[1] اس روایت کو حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے، ان کے علاوہ ابو یعلی اور امام احمد بن حنبل نے بھی اپنی اپنی مسندوں میں نقل کیا ہے، اس روایت میں بعض رواۃ کو ضعیف کہا گیا ہے لیکن چونکہ یہ روایت ایک ہی طریقہ سے نہیں بلکہ متعدد طرق و واسطوں سے مروی ہے، اس لیے اس کا ضعف دور ہو جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آقا کی زندگی بھر وہ رہے گی تو اسی کے ساتھ، کیونکہ جو تعلق اس سے قائم ہو چکا ہے اس کو موت سے پہلے قطع کرنا تو مناسب نہیں ہے، لیکن بہرحال اب نہ تو وہ اس کی ملکیت سے نکل کر کسی دوسرے کی ملکیت میں جا سکتی ہے اور نہ آقا اس کو دوسرے کی ملکیت میں دے سکتا ہے، ظاہر ہے کہ جب انتقال ملکیت ہی ممکن نہیں ہے تو پھر اس کو فروخت کیسے کیا جا سکتا ہے؟

ان ارشادات نبوی کو ذہن میں رکھکر اب ایک نظر حضرت عمرؓ کے فیصلہ اور ان کے فرمودات پر ڈال لیجئے،

آپ نے یہ حکم نافذ فرماتے ہوئے اعلان فرمایا کہ

ایما ولیدة ولدت من سیدها	جس لونڈی کو بھی اس کے آقا کے صلب سے
فانه لا یبیعها ولا یهبها ولا	اولاد ہو جائے اس کو اس کا آقا نہ تو بیچ
یورثها وهو یستمتع منها فاذا	سکتا ہے اور نہ ہبہ کر سکتا ہے، اور نہ وراثت
مات فهی حرة	میں اس کو کوئی پا سکتا ہے، وہ اس سے زندگی
	میں متمتع ہوئے، مرنے کے بعد وہ آزاد سمجھی جائیگی،

کیا اوپر جو حدیث نبوی نقل کیگئی ہے، اس میں اور حضرت عمرؓ کے اس حکم میں ذرہ برابر بھی فرق ہے، مشہور اور ممتاز تابعی حضرت سعید بن المسیب بیان کرتے ہیں کہ اسی بنا پر جب حضرت فاروقؓ نے ان کو آزاد کرنے کا حکم دیا تو یہ بھی واضح کر دیا کہ میں اپنے جی سے ایسا حکم نہیں دے رہا ہوں، بلکہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی انھیں آزاد قرار دیدیا ہے، ابن مسیب کے الفاظ ملاحظہ ہوں،

ان عمر اعتق امهات الاولاد	حضرت عمرؓ نے جب انکی آزادی کا حکم دیا تو فرمایا کہ
وقال اعتقهن رسول الله صلی الله علیه وسلم	ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی آزاد کر دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ میں جمہور امت کا فیصلہ ہے کہ امہات الاولاد کی فروخت ممنوع ہے، ائمہ اربعہ جو جمہور امت کی نمایندگی کرتے ہیں، وہ بھی اس مسئلہ میں متفق الرائے ہیں،

واتفقوا علی انہ لا تباع امہات الاولاد (افصاح ص۲۹۴)	ائمہ اربعہ متفق ہیں کہ امہات الاولاد کو فروخت نہیں کیا جاسکتا،

شیخ ابن ہمام اپنی مشہور کتاب فتح القدیر میں لکھتے ہیں:

ھذا مذھب جمھور الصحابۃ والتابعین والفقھاء الا من لا یعتد بہ کبشر المریسی وبعض الظاھریۃ فقالوا یجوز بیعھا	یہ مسلک تمام جمہور صحابہ، تابعین اور فقہا کا ہے، صرف چند ناقابل اعتنا آدمی ایسے ہیں جو اس کی فروخت کے قائل ہیں، مثلاً بشیر مریسی معتزلی اور بعض ظاہری،

امت کے چند افراد جو ام ولد کی فروخت کے قائل ہیں، ان کے استدلال کی بنیاد حضرت جابر بن عبد اللہؓ کا یہ بیان ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں امہات الاولاد کو فروخت کر دیا کرتے تھے، مگر حضرت عمرؓ نے اس سے روک دیا تو ہم رک گئے۔" (ابوداؤد)

لیکن حضرت جابرؓ کے اس بیان سے یہ بالکل نہیں معلوم ہوتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی اجازت دی ہو یا آپ کو اس کا علم ہوا ہو، اور آپنے منع نہ فرمایا ہو، یہ بات ضرور اہمیت رکھتی ہو کہ ایک صحابی عہد نبوی کا یہ تعامل بتارہے ہیں لیکن دو وجہوں سے اس بیان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی، ایک یہ کہ اوپر آپکے صریح ارشادات کے مقابلہ میں اس ایک بیان کو ترجیح نہیں دی جاسکتی، دوسرے یہ کہ کسی صحابی کے بیان کی اہمیت اور اس کی شرعی حیثیت اس وقت ہوتی ہو جب اس کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر بھی ہو، یعنی اس واقعہ کا آپ کو علم ہوا ہو اور آپنے اسے پسند یا ناپسند فرمایا ہو یا اس پر خاموش رہے ہوں، جب تک آپ کی تقریر نہ ہو اس وقت تک

اس کا قوی امکان ہے کہ آپ کو اس واقعہ کا علم ہی نہ ہوا ہو، اور جب تک آپ کو علم نہ ہوا ہو اس کی شرعی یا غیر شرعی حیثیت کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا، اور اس کا امکان اسلیے بھی زیادہ ہے کہ امہات الاولاد کی خرید و فروخت کا موقع شاذ و نادر ہی پیش آتا تھا، یہ عام خرید و فروخت کی طرح روزمرہ کی چیز نہیں تھی کہ اس کا علم لامحالہ آپ کو ہو ہی جاتا، اور یہ بات اس لیے اور زیادہ قرین قیاس ہے کہ لونڈیوں کی اتنی کثرت عہد نبوی میں تھی بھی نہیں جتنی کہ روم و ایران کے فتح ہونے کے بعد ہوئی، امام خطابی معالم السنن میں جابر بن عبد اللہؓ کے بیان کے بارے میں لکھتے ہیں:

یحتمل ان یکون ھذا الفعل منھم فی زمان النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو لا یشعر بذالک لانہ امر یقع نادراً ولیست امھات الاولاد کسائر الرقیق	اس بات کا قوی احتمال ہے کہ عہد نبوی میں صحابہ نے ایسا کیا ہو اور آپ کو اس کا علم نہ ہوا ہو، اس لیے کہ ام ولد کی خرید و فروخت کا معاملہ شاذ و نادر ہی پیش آتا تھا، اور اسلیے بھی کہ امہات الاولاد عام غلاموں کی طرح ۔

اس مسئلہ کے ہر پہلو کو ناظرین کے سامنے رکھدیا گیا ہے، اب وہ خود ہی فیصلہ کریں کہ حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ کو خلافِ سنت کہنا کسی طرح صحیح ہوسکتا ہے؟ کیا ایسا کہنا اس مسئلہ سے انتہائی ناواقفیت کی دلیل نہیں ہے؟

بیس رکعت باجماعت تراویح | اس سلسلہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں آٹھ رکعتیں تراویح پڑھی جاتی تھیں، مگر حضرت عمرؓ نے اسے بیس رکعت کر دیا، اس موضوع پر اتنا کچھ لکھا جاچکا ہے کہ مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن سلسلہ اولیات عمر کی ایک کڑی یہ بھی ہے اس لیے مختصراً چند باتیں عرض کر دی جاتی ہیں،

سب سے پہلے تو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ یہ مسئلہ نہ تو کسی چیز کی تحریم و تحلیل کا ہے اور نہ اس کا تعلق فرائض شرعی سے ہے، بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ سنت مؤکدہ ہے، اس لیے اس کو ان مسائل پر قیاس نہیں کیا جا سکتا جن کا تعلق حرام و حلال یا فرائض سے ہے،

دوسری بات یہ ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ پنج وقتہ نمازوں کے علاوہ جتنی اور نفل اور سنت نمازیں آپ نے پڑھی ہیں، ان میں آپ کا معمول یکساں نہیں رہا ہے، اور ایسا کرنا اس لیے ضروری تھا کہ فرض و واجب نمازوں اور مؤکدہ اور غیر مؤکدہ سنتوں میں فرق ہو جائے، مثال کے طور پر نماز تہجد کو لے لیجیے، نماز تہجد آپ نے ہمیشہ مزاولت اور مداومت سے پڑھی، مگر اس کی رکعتوں میں ہمیشہ آپ کمی بیشی فرمایا کرتے تھے.

اسی طرح نماز تراویح یعنی رمضان میں نوافل پڑھنے کے سلسلہ میں بھی آپ کا طرز عمل یکساں نہیں تھا، کثرت سے حدیثوں میں یہ ذکر ہے کہ آپ دوسرے زمانہ میں عبادت کرنے میں جتنی محنت و مشقت اٹھاتے تھے اس سے بہت زیادہ رمضان میں فرماتے تھے، آپ کے ساتھ تمام صحابہ کا معمول بھی یہی تھا کہ جس سے جس قدر ہو سکتا تھا، وہ نفل پڑھتا تھا، دوسرے زمانہ میں آپ یا صحابۂ کرام جو نفلیں پڑھتے تھے، وہ عموماً انفرادی طور پر اپنے گھروں میں پڑھتے تھے، مگر رمضان میں صحابہ میں بعض لوگ مسجد میں بھی آکر انفرادی طور پر بھی نفل پڑھتے تھے، اور بعض لوگ باجماعت بھی، گو یہ جماعت فرض نمازوں کی طرح نہیں ہوتی تھی، بلکہ دو دو چار چار آدمی مل کر پڑھ لیتے تھے یعنی بیک وقت کئی کئی جماعتیں ہوتی تھیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیفیت دیکھی تو ایک سال آپ خود بنفس نفیس مسجد میں تشریف لائے اور تین یا چار دن تک صحابہ کیساتھ باجماعت نماز تراویح ادا فرمائی، تیسرے دن اس نماز میں صحابہ کا اتنا ہجوم ہوا کہ مسجد نبوی میں جگہ نہیں تھی، آپ نے جب صحابہ کے ذوق شوق کی یہ کیفیت دیکھی تو آپ نے مسجد میں آنا موقوف فرما دیا صحابہ نے جب وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ "مجھے خوف ہوا کہ یہ ذوق و شوق

دیکھ کر اللہ تعالیٰ اسے تمہارے اوپر فرض نہ کر دے اور تم اس ذوق شوق کو باقی نہ رکھ سکو اور ایک فرض کے تارک بن کر گناہ کا بوجھ اپنے سر پر لاد لو"

بعض روایات میں ہے کہ پہلی رات کو آپ نے ایک پہر تک دوسری رات کو دو پہر تک اور تیسری یا چوتھی رات کو اتنی دیر تک نماز تراویح پڑھی کہ صحابہ کو یہ خوف ہونے لگا کہ کہیں سحری نہ چلی جائے"

غرض یہ کہ آپ سے جتنی روایات مروی ہیں ان سب میں چند باتیں مشترک ہیں، رمضان میں کثرت سے نوافل پڑھنا، صحابہ کا متفرق جماعتوں میں تراویح پڑھنا، تین یا چار دن تک مسجد میں آپ کا خود آکر باجماعت نماز تراویح پڑھنا، زیادہ سے زیادہ قرآن پڑھنا، اب رہا تو یہ جو کچھ اختلاف ہے وہ تعداد رکعات کی تعیین میں ہے، تو جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ فرض نمازوں اور فرض کے ساتھ جو سنتیں پڑھی جاتی ہیں، ان کے علاوہ دوسری تمام نفل نمازوں میں آپ کا طرز عمل مختلف ہوتا تھا، ان میں نہ تو آپ خود کوئی مقررہ تعداد ادا فرماتے تھے، اور نہ صحابہ کو اس کا حکم فرماتے تھے، چنانچہ یہی بات تراویح میں تھی، آپ نے کسی دن بھی پہلے سے کچھ رکعتیں متعین کر کے نفلیں نہیں پڑھیں، نہ تو اپنی انفرادی تراویح میں اور نہ اس تراویح میں جو آپ نے تین دن تک مسجد میں ادا فرمائی، اسی بنا پر صحابہ سے تعداد رکعات کے سلسلہ میں مختلف روایتیں مروی ہیں، کسی میں ۸ رکعت تراویح اور تین رکعت وتر کا ذکر ہے، کسی میں ۱۰ رکعت تراویح اور تین رکعت وتر کا ذکر ہے، کسی میں بیس رکعت تراویح اور تین رکعت وتر کا ذکر ہے، کسی میں ۳۶ رکعت تراویح اور تین رکعت وتر کا ذکر ہے، اور کسی میں ۳۸ رکعت تراویح کا ذکر ہے اور ۳ رکعت وتر کا، غرض یہ کہ صحابۂ کرامؓ میں جن صاحب نے جو تعداد زیادہ صحیح سمجھی، یا انھوں نے جتنی رکعتیں پڑھتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، اتنی بیان کر دی۔ یا

یا جس میں انھوں نے امت کیلئے سہولت دیکھی اوسکے مطابق فتوی دیا اور ان میں سے کوئی فتوی سنت نبوی کے خلاف نہیں تھا، حضرت عمرؓ نے جس طرح بے شمار امور میں نظم وضبط قائم کیا، اس طرح تراویح میں بھی ایک نظم قائم کیا، یعنی انھوں نے یہ حکم دیا کہ لوگ ایک امام کے پیچھے باقاعدہ جماعت سے نماز تراویح پڑھیں، تعداد رکعات میں آپنے ۸۔ ۲۰۔ ۳۶ کے درمیان بیچ کی سنت کو اختیار فرمایا یعنی، ۲۰ رکعت تراویح اور ۳ رکعت وتر،

اوپر سنت نبوی کی جو تفصیل کی گئی ہے، اس کی روشنی میں اب حضرت عمرؓ کے اس طرز عمل کو ملاحظہ کیجئے، اس میں کون سی چیز ایسی ہو جو ان کی ایجاد کہی جاسکتی ہے؟ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے پورے مہینے نفل نمازیں نہیں پڑھتے تھے؟ کیا آپ کے علم میں صحابہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں مسجد میں تراویح کی نماز نہیں پڑھتے تھے؟ کیا خود آپنے تین دن صحابہ کے ساتھ باجماعت نماز تراویح نہیں ادا فرمائی؟ کیا آپ او صحابہ اس نماز میں زیادہ سے زیادہ قرآن نہیں پڑھتے تھے؟ کیا آپ او صحابہ انتہائی ذوق وشوق سے یہ نماز ادا نہیں فرماتے تھے؟ کیا آپکے ارشاد سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اگر آپ کو فرض ہوجانے کا خطرہ نہ ہوتا تو آپ باجماعت نماز تراویح کو برابر جاری رکھتے؟

غرض یہ کہ جس حیثیت سے بھی دیکھا جائے، حضرت عمرؓ کا طرز عمل بالکل سنت نبوی اور منشائے رسول کے مطابق معلوم ہوتا ہے، آپنے جو کچھ کیا، وہ یہ کہ اس کو مہینہ بھر باقاعدہ جماعت کے ساتھ ضروری قرار دیا، اور یہ بھی حکم دیا کہ پورا قرآن اس میں ختم کیا جائے، یہ دونوں باتیں بھی منشائے نبویؐ کے خلاف نہیں ہیں، مہینہ بھر آپ سے رمضان میں نفل پڑھنا بھی ثابت ہے اور قرآن کا پڑھنا بھی، آپ رمضان میں صرف نفل نمازوں ہی میں قرآن نہیں پڑھتے تھے، بلکہ اس خیال سے کہ قرآن کا کوئی لفظ حافظے سے محو نہ ہوگیا ہو، ہر سال حضرت جبریلؑ سے پورے قرآن کا دورہ بھی فرمالیا کرتے تھے، حدیث میں ہے کہ آپ ہر سال رمضان میں ایک بار حضرت جبریلؑ سے قرآن کو دہرا لیا کرتے تھے، لیکن جس سال آپکا وصال ہوا، آپنے اس سال ان سے دوبار دور فرمایا،

تاکہ قرآن کا ایک ایک لفظ امت کو بے کم وکاست آپ سکھا اور پڑھا جائیں،

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باجماعت تراویح کو پسند فرمایا تھا، مگر جماعت اس لیے ترک فرمادی تھی کہ یہ فرض نہ ہوجائے، آپ کی وفات کے بعد وحی کا سلسلہ چونکہ منقطع ہوگیا تھا، اور اب اس کے فرض ہوجانے کا خطرہ باقی نہیں تھا، اس لیے حضرت عمرؓ نے آپکے منشا کی تکمیل کردی، جب آپسے پورے مہینہ نفل میں قرآن پڑھنا بھی ثابت ہے، اور اس کا یاد کرنا اور دور کرنا بھی، تو ان دونوں باتوں کے پیش نظر اگر حضرت عمرؓ نے پورے مہینہ قرآن سننے اور سنانے کا حکم دیا تو اس میں نئی بات کون سی تھی، جس طرح آپنے قرآن کے دور کے لیے اس مبارک مہینہ کو اختیار فرمایا تھا، اسی طرح حضرت عمرؓ نے اس کے یاد رکھنے کی یہ صورت اختیار فرمائی کہ اس کو تراویح میں سنایا جائے، تاکہ سنانے والا پوری توجہ سے سنا سکے اور سننے والے پوری توجہ سے سن سکیں، کیونکہ نماز میں اس کا موقع زیادہ ہوتا ہے، اس طرح دونوں کو قرآن کے یاد کرنے میں مدد ملے گی، اور واقعہ یہ ہے کہ اگر تراویح میں پورے قرآن سننے کا رواج ختم ہوجائے تو مشکل سے دوچار حافظ ملیں گے،

آپنے اسے نعم البدعہ یعنی ایک نئی اچھی بات اس لیے کہی کہ عہد نبوی کے بعد باجماعت تراویح کا اہتمام سب سے پہلے آپ ہی نے فرمایا تھا، اور اس لیے بھی یہ نئی بات تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تراویح کے علاوہ پورے قرآن کا دور فرمایا کرتے تھے اور حضرت عمرؓ نے اس کو تراویح میں پڑھنے کا حکم فرمایا، گویا آپکے طرز عمل کا کوئی جز ایسا نہیں ہے جس کا ثبوت سنت نبوی سے نہ ملتا ہو، آپ نے بس اتنا کیا کہ ان منتشر اجزا کو جوڑ کر ان میں ایک اجتماعیت پیدا کردی، اور بیشتر صحابہ نے اس کو من وعن مان لیا، اگر یہ بالکل ہی نئی بات ہوتی تو صحابہ کی اکثریت کبھی بھی اسے نہ مانتی، چونکہ اس نماز کا تعلق فرائض سے نہیں تھا، اس لیے اس نظم

کے قائم کرنے کے بعد بھی آپ نے اس کے لیے سب کو مجبور نہیں کیا، بلکہ صحابہ میں اب بھی کچھ لوگ کم و بیش نماز تراویح پڑھتے تھے اور کوئی کسی پر نکیر نہیں کرتا تھا، کیونکہ تمام صحابہ کا طرز عمل سنت نبوی کے مطابق تھا،

شاعری کی اصلاح

مولانا جعفر صاحب ندوی نے اولیاتِ عمر کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں مسلمان شعرا کو ہجو اور تشبیب (عشقیہ اشعار) کہنے کی پوری آزادی تھی اور وہ کہتے بھی تھے. مگر حضرت عمرؓ نے ان کی اس آزادی پر پابندی لگادی، یعنی ان کو ہجو و تشبیب کہنے سے روکدیا،

اگر یہ بات کوئی ایسا آدمی کہتا جس کی نظر براہ راست قرآن و حدیث پر نہ ہوتی تو نہ یہ بات باعث حیرت و استعجاب ہوتی اور نہ اس کے جواب ہی کی ضرورت تھی، لیکن جس نے عالم ہونے کی باقاعدہ سند فراغت حاصل کی ہو، اس کے قلم و زبان سے اگر کوئی غیر محقق اور بے دلیل بات نکلتی ہے تو حیرت و استعجاب کے ساتھ افسوس بھی ہوتا ہے اور جواب دینے کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے،

میں نے کتاب تو نہیں دیکھی، مگر اشتہار پر نظر پڑی ہے کہ مولانا نے حدیث نبوی پر ریاض السنۃ کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے، اس سلسلہ میں تو مولانا نے احادیث کی متداول کتابوں کا سرسری نہیں بلکہ تحقیقی اور غائر مطالعہ کیا ہوگا، مگر کیا مولانا کوئی ایک صحیح حدیث نبوی بھی ایسی پیش کر سکتے ہیں جس سے ہجو و تشبیب کو جانے دیجئے، نفس شاعری ہی کی مطلقاً بغیر کسی قید کے اجازت نکلتی ہو، اور پھر حضرت حسانؓ، عبداللہ بن رواحہؓ، کعب بن مالکؓ کی شاعری سے اس پر استدلال کرنا تو مزید ستم ظریفی ہے، کیا دربار نبوی کے یہ شعرا اسی طرح اجنبی عورتوں کا نام لے لے کر یا بغیر نام لیے غیر اخلاقی تشبیبیں کہتے تھے جس طرح امرء القیس زہیر اور دوسرے جاہلی شعرا کہتے تھے، کیا ان کی ہجو گوئی بھی اسی انداز و اسلوب کی ہوتی تھی،

جس طرح حطیئہ اور تابط شرا ہجو کہتے تھے، کیا جاہلی شعراء کی طرح مسلمان شعراء کی شاعری اور شعر خوانی بھی اتنی عریاں ہوتی تھی کہ عورتوں کا باہر نکلنا دشوار ہوگیا تھا؟

اس مسئلہ میں قرآن و سنت سے تھوڑی سی تفصیل کردیجاتی ہے، جس سے اندازہ ہوجائیگا کہ حضرت عمرؓ نے جو کچھ کیا وہ عین کتاب و سنت کے منشا کے مطابق کیا اور انھیں یہی کرنا چاہیے تھا،

شاعری کی جو بھی تعریف کیجائے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ شاعری خالص ایک جذباتی چیز ہے جس کو عمل و کردار کے بنانے کا تو نہیں، البتہ اچھے یا برے جذبات کو تسکین دینے یا انکو برانگیختہ کرنے کا کام لیا جاسکتا ہے، چونکہ اچھے جذبات کو تسکین دینے یا انکو ابھارنے کی انسانی زندگی میں کبھی کبھار ضرورت پیش آجاتی ہے، اسلیے اسلام نے نفس شاعری کو حرام تو قرار نہیں دیا، لیکن اس نے اس مشغلہ کی بہت زیادہ ہمت افزائی نہیں کی، جاہلیت میں عربوں کے یہاں شاعر ہونا سب سے زیادہ فخر و مباہات کی بات سمجھی جاتی تھی، چنانچہ قرآن کی فصاحت و بلاغت دیکھکر ان کے ذہن میں اس سے زیادہ کوئی اونچی بات نہیں آئی تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ ملکہ حاصل ہے، مگر قرآن نے نہایت ہی صراحت و وضاحت سے اس کی تردید کی، اگر واقعی یہ کوئی باعث عزت و افتخار شے ہوتی تو قرآن اتنی صراحت سے آپ کے دامنِ عصمت سے یہ داغ نہ دھوتا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے کہا جارہا ہے کہ

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (یٰس)	ہم نے نبی کو شاعری کی تعلیم نہیں دی اور نہ یہ چیز نبوت کے شایانِ شان تھی،

پھر قرآن نے عام شعراء کی زندگی کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ انتہائی نفرت و حقارت سے

والشعراء يتبعهم الغاوٗن	(شعراء ۲۲۶-۲۲۴)	شعرا کی پیروی وہی لوگ کرتے ہیں جو خود بے راہ رو
الم تر انهم في كل واد يهيمون		ہوتے ہیں کیا تم دیکھتے نہیں کہ وہ خیالات کی ہر وادی میں
وانهم يقولون ما لا يفعلون		مارے پھرتے ہیں، اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو تا...

البتہ جو ان صفات کے ساتھ شاعری کرتے ہیں ان کو ان سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے،

الا الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت — مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے
وذکروا اللہ کثیرا وانتصروا — اور اپنی شاعری کے ذریعہ خدا کی یاد تازہ کی
من بعد ما ظلموا — اور کسی ظلم کا جواب دیا تو ایسی شاعری میں
(شعرا ۱۶) — کوئی مضائقہ نہیں ہے)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ جو شاعری بے راہ روی پیدا کرنے، برے جذبات کو ابھارنے اور قول و عمل میں تضاد پیدا کرنے کا سبب ہو وہ ناپسندیدہ ہے، اور جو شاعری پسندیدہ ہے اس کے لیے تین قیدیں لگی ہوئی ہیں،

یعنی خود شاعر یقین و عمل اور اخلاق و کردار کی دولت سے مالا مال ہو اور اس کی شاعری بھی خدا کی یاد تازہ کرنے کا سبب ہو اور اگر کبھی اس کو اپنی زبان سے ہجو کرنے یا ناروا بات نکالنے کی ضرورت پیش ہی آ جائے تو پھر اس کی اجازت اس کو اس وقت دی جا سکتی ہے جبکہ اس کے اوپر کوئی ظلم ہوا ہو یا اس کی عزت و آبرو پر حملہ کیا گیا ہو، دوسری جگہ قرآن میں ہے:

لا یحب اللہ الجہر بالسوء — اللہ تعالیٰ بری بات زبان پر لانے کو پسند نہیں کرتا،
من القول الا من ظلم — لیکن جس پر ظلم ہوا ہو (یعنی وہ اپنی زبان پر کوئی ایسی بات لائے تو معاف ہے)

اور اس میں بھی حد اعتدال سے باہر نکل جانا دوسرا ظلم ہوگا، اس لیے آیت کے آخر میں تنبیہ کر دی گئی ہے کہ خدا سننے والا اور جاننے والا ہے کہ تم بھی اس کے ساتھ ظلم تو نہیں کر رہے ہو،

ان قرآنی ہدایات کی تفصیل حدیث نبوی میں ملاحظہ کیجئے،

سورہ شعراء کی مذکورۂ بالا آیتیں نازل ہوئیں تو بعض مسلمان شعراء شاعری کرنے

سے ڈرے اور اس سے گریز شروع کر دیا، خاص طور پر حضرت کعب بن مالک کے بارے میں ہے کہ انھوں نے خدمت نبوی میں عرض کیا کہ ہمارے بارے میں ایسی ایسی آیتیں نازل ہوئی ہیں، مقصد یہ تھا کہ اب ہم شاعری کیسے کر سکتے ہیں، تو آپ نے فرمایا کہ تم اس کے مخاطب نہیں ہو، مومن تو اپنی تلوار اور زبان دونوں سے جہاد کرتا ہے۔ المومن یجاھد بسیفہ ولسانہ

ایک بار آپ کے سامنے شعر و شاعری کا تذکرہ ہوا تو آپ نے فرمایا کہ شاعری بھی ایک طرز کلام ہے جس میں اچھائی اور برائی دونوں ہوتی ہے، اچھے کلام کو اچھا کہا جائے گا اور برے کلام کو برا کہا جائے گا۔ (مشکوٰۃ)

آپ نے فرمایا کہ بعض اشعار میں حکمت کی باتیں ہوتی ہیں، ان من الشعر لحکمۃ حکمت کے لفظی معنی روکنے کے ہیں، اور عموماً عدل و انصاف اور علم و فضل کی بات آدمی کو برائی سے روکنے کا سبب ہوتی ہے، اس لیے اس کو حکمت کی بات کہتے ہیں، مقصد یہ ہے کہ بعض اشعار ایسے ہوتے ہیں جن میں جہالت و جاہلیت اور سفہ و حماقت کے بجائے عدل و انصاف اور اخلاق و کردار کی باتیں ہوتی ہیں،

پھر آپ نے اس حکمت کی تشریح میں بعض اشعار پڑھکر اور سنا کر بھی عام صحابہ کو اس کا مفہوم سمجھا دیا، آپ نے جاہلی شاعر لبید کا یہ مصرعہ

الا کل شئ ما خلا اللہ باطل — خدا کے علاوہ سب چیزیں باطل و بے حقیقت ہیں،

پڑھکر فرمایا کہ اصدق کلمۃ قالھا۔ بڑی اچھی اور سچی بات اس نے کہی ہے،

امیہ بن الصلت جاہلیت کا مشہور موحد شاعر گزرا ہے، جس کے اشعار حق و صداقت اور حکمت سے پر ہوتے تھے، آپ اس کے اشعار کو شوق و ذوق سے پڑھوا کر سنتے تھے،

اب اس تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کیجئے،

ابتدائے اسلام میں جاہلیت کے مشاہیر شعراء خاص طور پر سبعہ معلقہ کے اشعار عربوں کے بچے بچے کی زبان پر تھے، لیکن آپ نے نہ نبوت سے پہلے ان سے کوئی دلچسپی لی اور نہ نبوت کے بعد ان کی طرف کوئی اعتنا کیا، کیا سبعہ معلقہ سے بھی بڑھ کر عربی شاعری کا کوئی شاہکار ہو سکتا ہے؟ مگر آپ نے پورے دفتر میں لبید کا ایک مصرعہ اور اتنے بیشمار شعراء میں صرف امیہ بن الصلت کو پسند فرمایا،

آپ کے ارشادات سے اب شعر کی برائی بھی سن لیجئے؛

آپ نے فرمایا کہ فحش اور بے باکانہ کلام نفاق کی ایک علامت ہے ۔ (مشکوٰۃ)

آپ نے ایک بار فرمایا کہ

لان یمتلی جوف رجل قیحاً یریہ — کوئی آدمی اپنا پیٹ قے سے بھر لے یہ بہتر ہے

خیر من ان یمتلی شعراً (بخاری و مسلم) — بجائے اسکے کہ وہ شعر و شاعری میں غرق رہے،

آپ نے صرف غلط، بے مقصد اور عریاں شاعری کی مذمت ہی نہیں کی بلکہ عملاً و حکماً اس سے باز رکھنے کی کوشش بھی فرمائی،

حضرت ابو سعید خدریؓ کا بیان ہے کہ ایک بار مقام عرج میں آپ تشریف فرما تھے، ایک شاعر عریاں و فحش کلام پڑھتا ہوا جا رہا تھا، آپ نے سنا تو فرمایا،

خذوا الشیطان او امسکوہ — اس شیطان کو پکڑ لو اور اشعار پڑھنے سے اس کو روک دو،

آپ کے اس ارشاد سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں،

(۱) اچھے اشعار تو آپ اپنی زبان پر لانا اور سننا پسند فرماتے تھے، مگر عریاں اور فحش کلام کو پڑھنا تو درکنار اس کو نہ تو آپ سننا پسند فرماتے تھے اور نہ صحابۂ کرام، چنانچہ حضرت ابو سعیدؓ نے ان اشعار کو نقل کرنا بھی پسند نہیں فرمایا،

(۲) آپ نے عریاں اور فحش اشعار کہنے والے اور پڑھنے والے کو شیطان فرمایا ہے یعنی جس طرح شیطان آدمی کو برے خیالات اور جذبات میں پھنسا کر باطل، گمراہی اور برائی کی راہ کی طرف لے جاتا ہے، اسی طرح ایسے شاعر اور شاعری بھی شیطنت کا کام کرتے ہیں،

(۳) آپ نے فحش اور عریاں اشعار کو سننا پسند نہیں فرمایا تو کہنا تو اس سے بڑا جرم ہے،

(۴) سب سے اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ عریاں شاعری اور فحش کلام کہنے والے کو حکماً و قانوناً اس سے روک دینا چاہیے،

باوجودیکہ آپ عرب کی شعر پرور فضا میں پلے اور بڑھے تھے، مگر شاعری جیسی جذباتی چیز سے آپ کے قدوسی و نبوی مزاج کو اتنا بعد تھا کہ پوری زندگی میں مشکل سے دو چار شعر آپ نے اپنی زبان مبارک سے ادا فرمائے تھے۔

ہجو کے جواز کے سلسلہ میں حضرت حسانؓ اور عبداللہ بن رواحہؓ کی شاعری کو پیش کیا جاتا ہے، یہ تو صحیح ہے کہ آپ نے حضرت حسانؓ کو عبداللہ بن رواحہؓ کو اور کعب بن مالکؓ کو ہجو کہنے کی اجازت دی، اور حضرت حسانؓ کیلئے تو آپ نے مسجد نبوی میں منبر بھی رکھوایا، اور انکے اشعار خود سنے بھی، مگر یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کہ یہ ہجو نہ تو جاہلی شعرا کی تھی اور نہ اموی دور کے شعرا جریر و فرزدق کی، بلکہ وہ ہجو حضرت حسانؓ، حضرت ابن رواحہؓ اور ابن مالکؓ کی تھی، اور پھر یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ان کو بھی ہجو کی اسی وقت اجازت تھی جب تک وہ جہاد باللسان ہو، نہ یہ کہ نری لسان تو ہو اور جہاد غائب ہو، حضرت حسانؓ کے اشعار سن کر جو کچھ آپ فرماتے تھے اس پر ایک غائر نظر ڈال لیجئے،

ان اللہ یؤید کٗ بروح القدس — اللہ تعالیٰ روح القدس کے ذریعہ اس وقت

ما نافحت عن اللہ و رسولہ — تک تمہاری مدد کرتا رہے گا جبتک تم خدا

(بخاری و مسلم) — و رسول کیطرف سے مدافعت کرتے رہوگے

کیا اس ہجوگوئی سے نفس ہجو پر استدلال کرنا صحیح ہوگا، قرآن وحدیث کی ان ہدایات کی روشنی میں اب حضرت عمرؓ کا طرز عمل ملاحظہ ہو۔

مذکورہ بالا ہدایات کی وجہ سے عہد نبوی سے عربی شاعری کا رخ بالکل بدل گیا تھا اور اس کا اثر عہد صدیقی تک رہا، لیکن حضرت عمرؓ کے عہد میں ایرانی اور بعض دوسرے عناصر کے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کی وجہ سے عربی عصبیت میں پھر سے کچھ ابال آنے لگا تھا، گو حضرت عمرؓ کے عہد میں یہ چیز بہت نمایاں نہیں ہوئی، لیکن اس کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے،

عہد نبوی میں جو ہجویں کہی گئیں وہ ہجو برائے ہجو نہیں تھی، بلکہ ان میں ان الزامات کی تردید ہوتی تھی جو قریش کے شعرا خدا اور اس کے رسولوں پر لگاتے تھے، ذاتی عداوت کی بنا پر ایک ہجو بھی نہیں کہی گئی تھی، اسی طرح اس وقت تشبیب کہنا قصیدے کا ایک لازمی جز سمجھا جاتا تھا، اس لئے بالکلیہ اس کا ترک کرنا تو مشکل تھا، مگر عہد نبوی میں جن شعراء نے تشبیب کہی تھی وہ کسی اجنبی عورت کے حسن وعشق کی داستان نہیں ہوتی تھی، بلکہ وہ اپنی بیوی یا کسی اور محرم عورت کو مخاطب کرکے اپنے جذبات کا اظہار کرتے تھے، لیکن اس میں عریانی کا نام نہیں ہوتا تھا، چنانچہ آپ کعب بن زہیرؓ کے نعتیہ قصیدے کی تشبیب کو ملاحظہ کیجئے اور پھر حضرت عمرؓ کے عہد کے بعض شعرا کی تشبیبیں ملاحظہ کیجئے، آپ کو دونوں میں صاف فرق نظر آئے گا، حضرت عمرؓ کے عہد میں بعض شعرا نے ایسی تشبیبیں کہنی شروع کر دی تھیں کہ بعض عورتوں کا حج کے زمانہ میں نکلنا بند ہوگیا تھا، چند واقعات ملاحظہ ہوں،

حطیئہ عہد فاروقی کا ایک مشہور ہجوگو شاعر تھا، جس نے عہد صدیقی میں اسلام قبول کیا تھا، لیکن صاحب طبقات الشعرا کے بیان کے مطابق کان رقیق الاسلام ولئیم الطبع، اس کا رشتۂ اسلام بھی کمزور تھا اور دنی الطبع بھی تھا، اس کی دنائت کا حال یہ تھا کہ اس نے اپنی ماں

اپنے باپ اور خاندان کے دوسرے تمام افراد کی ہجو کہی تھی، اور یہی نہیں، خود اپنی ہجو بھی کہہ ڈالی تھی، اسی عہد کا ایک خوش حال شاعر زبرقان بن بدر تھا جو اس کے پڑوس میں رہتا تھا، کسی بات پر حطیئہ اس سے ناراض ہوگیا، اور اس نے زبرقان کی ایک سخت ہجو کہہ ڈالی، زبرقان نے یہ معاملہ حضرت فاروقؓ کے سامنے پیش کیا، حضرت عمرؓ نے ہجویہ قصیدہ پر ایک سرسری نظر ڈالی اور فرمایا کہ اس میں تو کوئی خاص بات نظر نہیں آئی جس پر حطیئہ کو تنبیہ کی جائے، زبرقان نے کہا امیر المومنین اس کا آخری شعر ہی ملاحظہ کیجئے، اس میں کتنا سخت طنز اور کیسی شدید ہجو ہے،

دع المکارم لا ترحل لبغیتها واقعد فانک انت الطاعم الکاسی

چھوڑ دو تم مکارم اخلاق اور محاسن کے حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو تم کھاتے پیتے آدمی ہو گھر ہی میں بیٹھے رہو

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ کیا تم کھاتے پیتے آدمی نہیں ہو؟ زبرقان نے کہا کہ امیر المومنین، مگر اس نے طنز سے ایسا کہا ہے، حضرت عمرؓ نے حضرت حسانؓ کو فیصلہ کے لیے بلایا، حضرت حسانؓ نے قصیدہ سن کر کہا کہ امیر المومنین! اس نے ہجو نہیں کی ہے، بلکہ تیر اندازی و تیغ زنی کی ہے، حضرت عمرؓ نے اس کو فوراً قید کرنے کا حکم دیا، اور فرمایا کہ "بدبخت تجھ سے میں مسلمانوں کی عزت آبرو محفوظ رکھوں گا۔"[1]

اسی طرح ایک شاعر نجاشی تھا جس نے بنو عجلان کی ہجو کہی تھی، حضرت عمرؓ کے سامنے معاملہ پیش ہوا، تو انھوں نے حضرت حسانؓ اور حطیئہ جو غالباً اس وقت قید تھا، کے پاس فیصلہ کے لیے بھیجا، دونوں شاعروں نے اس کے شدید ذاتی ہجو ہونے کا فیصلہ کیا، حضرت عمرؓ نے نجاشی کو سخت تنبیہ کی اور فرمایا کہ

---

[1] طبقات الشعرا ص ۱۰۶

ان عدت قطعت لسانک اگر آیندہ تم نے پھر کسی کی ہجو کی تو تیری زبان کاٹ دونگا،

غور کیجئے کہ کیا حضرت عمرؓ ان ہجو گو شعرا کو جن سے لوگوں کی عزت آبرو تک محفوظ نہیں تھی، ہجو گوئی سے روکتے نہیں تو کیا ان کی دلجوئی کرتے؟ کیا عہد نبوی میں بھی کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ کسی شاعر نے ذاتی عناد کی بنا پر کسی کی عزت اتارنے کی کوشش کی ہو، پھر بھی اس کی روک ٹوک نہ کی گئی ہو کیا لوگوں کی عزت آبرو بچانے کے لیے قرآن میں کثرت سے احکام نہیں دیے گئے ہیں، کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے برے اور فحش اشعار کو ناپسند نہیں کیا ہے؟ کیا آپ نے ایک شاعر کو حکماً اشعار پڑھنے سے روک نہیں دیا تھا، پھر حضرت عمرؓ کا طرز عمل قرآن و سنت کے منشا کے مطابق ہوا یا اس کے خلاف؟

تطویل کے خیال سے دو ایک مثالوں پر اکتفا کیا گیا ہے، ورنہ اس کی متعدد مثالیں دیجا سکتی ہیں، کہ اگر حضرت عمرؓ نے اس معاملہ میں روک ٹوک نہ کی ہوتی تو جاہلی شاعری کی وہ تمام خرابیاں پھر عود کر آتیں جن کی یاد ابھی بہت سے بے راہ رو لوگوں کے دلوں میں انگڑائیاں لے رہی تھی، (باقی)

سلسلۂ سیر الصحابہ

اہل کتاب صحابہ و تابعین

یوں تو سیر الصحابہ کے سلسلہ میں صحابہ کے حالات و سوانح میں متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اور ان میں سے بعض بعض کے ۴، ۴، ۵، ۵ اڈیشن شائع ہو چکے ہیں، لیکن اہل کتاب صحابہ و تابعین پر الگ سے کوئی کتاب اس سلسلہ میں ابتک اردو زبان میں موجود نہیں تھی، اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، جسمیں جزیرۂ عرب کے یہود و نصاریٰ کی تاریخ اور انکے تمدنی و اخلاقی حالات کی تفصیل کے بعد ۹۳ اہل کتاب صحابہ، صحابیات، تابعین اور تابعات کے سوانح اور کارنامے بیان کیے گئے ہیں،

(مرتبہ مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین) قیمت للعہ

"منیجر"

حکیم ازرقی

از ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ایم اے، ایل ایل بی، صدر شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی

ابو المحاسن ازرقی (لباب ۲، صفحہ ۸۶) یا ابوبکر زین الدین بن اسمٰعیل الوراق الازرقی (چہار مقالہ، طبع قزوینی، ص ۴۴، ۱) ہرات کا مشہور شاعر ہے، طغان شاہ بن الپ ارسلان محمد کی مدح میں اس کا نام یا نسب یوں ہے:-

گر بزرجعفری و ستم نگیری خسروا بے نوائیہا و سرہا خورم من جعفری (چہار مقالہ ص ۴۴، ۱)

چہار مقالۂ نظامی عروضی (ایضاً ص ۴۳) میں ہے کہ ازرقی کے والد اسمٰعیل وراق (کتاب فروش) کے یہاں فردوسی چھ ماہ تک سلطان محمود غزنوی (م ۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء) کے خوف سے چھپا رہا، اس سے ظاہر ہے کہ ازرقی کے والد اور فردوسی معاصر اور دوست تھے، سلطان محمود کے بیٹے مسعود (م ۴۳۲ھ / ۱۰۴۱ء) کے زمانے میں سرخس اور مرو کے درمیان دندانقان کے مقام پر طغرل بیگ بن میکائیل بن سلجوق اور اس کے بھائی چغری بیگ نے مل کر مسعود کو ۸ رمضان ۴۳۱ھ مطابق ۲۳ مئی ۱۰۳۹ء (جس میں خود بیہقی موجود تھا، تاریخ بیہقی طبع تہران ص ۲۴۵ بعد) میں شکست دی، پھر ان کے چچا موسیٰ بیغو بن سلجوق اور یونس بن سلجوق وغیرہ نے متحد ہونے کا قول و قرار کیا اور مفتوحہ علاقوں کو آپس میں تقسیم کر لیا، (سلجوق نامہ ص ۱۷) ازرقی کے یہاں یونس بن سلجوق کی مدح میں ایک قصیدہ ملتا ہے، جو غالباً اس کا سب سے قدیم کلام ہے:-

مگر کہ زہرہ و ماہ ست نعت آں دو خواہ | کہ باسعادت زہرہ ست باطراوت ماہ
شفاہ ہیچ نگارے شفا کشتہ نداشت | تو کشتگان شفا را شفا دہی بشفاہ
یقیں کہ تاجِ بتاں خواندت اگر بنید | ابوالمظفر یونس نصیر ملکت شاہ
خدایگانے کز تیغ و کلک ملکتِ اوست | کمال قدرت و تائید عقل و پایۂ جاہ[1]
ایا شہے کہ سپہرِ ستارہ از پے فخر | غلام و بندہ سزد مر ترا دریں درگاہ
مخالفانِ چو ببینند مر ترا گہ جنگ | زروی آہن پوشی ہمی قبا و کلاہ
سیاہ روبہ گروہ و شہا ز ہیبتِ تو | سیاہ شیر علاماتِ شان میان سیاہ

(دیوان ازرقی ۲۶ صفحہ ۲-۹۲)

آخری شعر میں دشمن کے علم کی علامت "سیاہ شیر" بتائی گئی ہے۔ غزنویوں کے سیاہ علم اور شیر کی علامت کا ثبوت تو ملتا ہے (تاریخ بہرام شاہ۔ انگریزی۔ از غلام مصطفیٰ خاں، لاہور ۱۹۵۵ء، ص ۲۸-۳۱) لیکن ان کے "سیاہ شیر" کا واضح ثبوت مہیا نہیں ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ ۴۳۱ھ / ۱۰۳۹ء میں علاقوں کی جو تقسیم ہوئی تھی اور قاوردبن جغری بیگ بن میکائیل کرمان اور طبسین (راحت الصدور ص ۱۰۴) کا مالک ہوا تھا تو غالباً بعد میں اس سے یونس بن سلجوق کی کوئی جنگ ہوئی تھی، کیونکہ قاورد (بمعنی گرگ) کے طغرے کا نقش "قرہ ارسلان بیگ بن (سیاہ شیر) جغر بیگ" تھا (تاریخ افضل ص ۳) اور اس کے بیٹے امیران شاہ کی مدح میں اسی شاعر نے قلم کی علامت یہی بتائی ہے:

وزاں کہ شیر سیاہ ست نقش رایت او | دلیر تر بود اندر نبرد شیر سیاہ

(دیوان ازرقی، ایضاً)

شاعر کا ایک قدیم ممدوح حسن بھی ہے، جس کا غور سے تعلق ہے:

بمژدہ خواستن آں نور چشم و راحتِ جاں | بر من آمد پروین نما و ماہ نشاں

[1] مجمع الفصحاء، جلد اول ص ۱۵۰ میں یہاں "پایۂ جاہ" ہے۔

چہ گفت؟ گفت کہ گر رامشِ دل تو منم | برامشِ دل من جاں بیار، مژدہ ستاں
بیار مژدہ کہ اعزاز خلعتش فرمود | خدایگان ترا شہریار شاہ جہاں
شجاع دولتِ پایندہ سعد ملک حسن | امین شاہ عجم، میر غور و غرجستاں

(دیوان ازرقی، ایضاً)

نمونہ ایست ز آثار رائے او پروین | نشانہ ایست ز اجرائے قدر او سرطاں
زبہر زخم جگر گوشۂ مخالف او | بزخم تیر کند اژدہا بن دنداں

(مونس الاحرار ص ۹۲۳)

میرا خیال ہے کہ یہ ممدوح ابو علی حسن بن موسیٰ بن سلجوق ہے، جس کے حصے میں ۴۳۱ھ / ۱۰۳۹ء میں ہراۃ، بوشنج، سجستان و غور کی حکومت آئی تھی[1]، (اخبار الدولۃ السلجوقیہ ص ۱۷) اور آخری شعر میں "جگر گوشۂ مخالف" سے مراد مسعود غزنوی کا بیٹا مودود ہوگا جس سے بعد میں ان تراکمہ کی جنگیں ہوئی تھیں۔

۴۳۱ھ / ۱۰۳۹ء کی تقسیم کے بعد طغرل بیگ جیسے طاقتور شخص کو ۴۴۷ھ / ۱۰۵۵ء تک مفتوحہ علاقوں کی طرف سے اطمینان ہوا تھا (سلجوق نامہ ص ۱۸، راحت الصدور ص ۱۰۵) قاورد جب کرمان پہنچا تو وہاں ابو کالیجار بن سلطان الدولہ کا نائب بہرام بن لشکرستان تھا[2]، اس نے اپنی کمزوری کی بنا پر کرمان کی ولایت پیش کردی، اور اس کی دختر سے قاورد کی شادی بھی ہوئی (تاریخ افضل ص ۴)۔ ۴۴۲ھ سے قاورد نے کرمان اور اس کے اطراف کی بھی تسخیر شروع کی، جبال القفص اور عمان کی فتح کے بعد دربند سجستان کی فتح پر امیران شاہ ابن قاورد کی مدح میں ازرقی نے ۴۶ شعر کا قصیدہ لکھا:

ہمایوں جشن عید و ماہ آذر | خجستہ باد بر شاہ مظفر

[1] راحت الصدور (ص ۱۰۴) میں ہے کہ (حسن نہیں بلکہ اس کے والد) موسیٰ بیغو بن سلجوق کے حصے میں بست، ہراۃ، اور سیستان وغیرہ تھے [2] ابن الاثیر ج ۹ در حوادث ۴۴۰ھ

امیران شاہ بن قاورد چغری — جمال دین و دولت دست و یاور
بدربند سجستان آنکہ او کرد — مثال کردۂ حیدر بخیبر
چناں برکوہ زیں داشت شش ماہ — بجاے خواب خوش بالین و بستر
دریں شش مہ زمانے بر نیاسود — ز دار و گیر گردان معسکر
اگر بستان آزاری بپژمرد — بآذر بوستانے کن ز آذر

یہ فتح چونکہ چھ ماہ کی جنگ کے بعد حاصل ہوئی تھی (شعر ۴، ۵) اس لیے ماہ آذر (شعر ۶-۱) کے باوجود وہ "جشن عید" (شعر ۱) تعبیر ہے۔

ازرقی نے متعدد قصیدے امیران شاہ بن قاورد کی مدح میں لکھے ہیں۔ چند اس طرح شروع ہوتے ہیں:

اے عالی گون قرط پوشید آں چہ ماہ آسمان — مہر چہر آمد نبرد بندہ روز مہرگان
عید مبارک آمد و بربست رزمہ بار — زاں گونہ بست بار کہ ہرا رابست بار

ایک مرتبہ امیران شاہ، سیستان کے مقام فراہ میں تھا، اس وقت ازرقی نے لکھا تھا: (دیوان ازرقی صفحہ)

چو آفتاب شد از داج خود بخانۂ ماہ — بخیش خانزہ برگ بید و بادہ بخواہ
مرا شمال ہری بے ہری چہ آید خوش — چو شہریار خداوند من بود بفراہ
ہمام دولت عالی قوام ملت حق — جمال مملکت شہ امیر میران شاہ
خدایگانے، شاہنشہے، خداوندے — کہ بندہ ہست مراد او را زمانہ بے اکراہ

آخری شعر میں امیران شاہ کو "شاہنشاہ" کہا ہے، گو اس کی کوئی علیحدہ حکومت اپنے والد کی حکومت کے علاوہ نہیں تھی، ایک اور قصیدے میں شاعر نے اس طرح "شاہنشاہ" کہا ہے:-

بگداخت آبگینۂ شامی بر آبدان — وز آب چشم ابر بخندید بوستان
خسرو ہمام دولت میران شہ آنکہ اوست — تاج فخر بر سر شاہان باستان
شاہنشہے کہ شاکر و با آفریں روند — ز دار او ز در گروہمان او ز خوان
دہ سال بردہ کم او میزبان بود — خوش طبع تر شود چو شود پیش میہمان
اندر مصاف لشکر و در بزم کس ندید — مانند او مبارز چالاک و میزبان
جائے رسد ز گردش ایام کار او — کز او و شیر بگذرد و شاہ اژدہان

اس "شاہنشاہ" کا مہمان شاعر ہی ہوگا جو قریب دس سال سے اس کے پاس ہے (شعر ۴)، اب اگر قاورد کی حکومت کے آغاز (یعنی ۴۴۲ھ) سے ایک موٹا حساب لگایا جائے تو اس قصیدے کا زمانہ ۴۵۲ھ کے قریب متعین ہوتا ہے، شاعر نے اپنے ممدوحوں میں سے اکثر و بیشتر امیران شاہ بن قاورد ہی کو "شاہنشاہ" کہا ہے، اس لیے اس قصیدے میں اسی کے وزیر کا ذکر ہوگا،

چو کوس عید ز درگہ بکوفتند پگاہ — پگاہ رفت بہ عید آں نگار زیں درگاہ
فخار آل سری، خواجۂ عمید شرف — وزیر راد شہنشاہ ابن شاہنشاہ
ابوالحسن علی ابن محمد آں کہ بدوست — جمال مسند و صدر کمال دولت و جاہ

ایک قصیدے میں پورا نام اور القاب اس طرح آگئے ہیں:-

سدید دین، شرف و دولت، آفتاب کرم — ابوالحسن علی ابن محمد ابن سری[1]

اس کی مدح میں بھی متعدد قصیدے ہیں، ایک قصیدے میں القاب صرف اس قدر ہیں:

[1] سری موصلی (یعنی ابوالحسن السری بن احمد الکندی) ایک عربی شاعر کے انتقال کا ذکر ابن الاثیر کے یہاں ۳۶۰ھ کے ذیل میں آتا ہے، ممکن ہو کہ اسی کی نسل سے یہ ممدوح ہو۔

زینتِ دولت علی ابن محمد بوالحسن
آنکہ حسن دولت از تدبیراو زد داستاں

تاریخ افضل (ص ۵) میں ہے کہ جب قاورد کی تخت نشینی بردسیر میں ہوئی تو قاضی فزاری کو جو اس وقت "قاضی ولایت" تھا وزیر اور اس کے دبیر ابوالحسن کو قاضی بنایا، اس ابوالحسن کے متعلق یہ بھی ہے کہ "قاضی و شحنہ و عامل ہر ولایت را بعدالت وصیت فرمود" اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ یہی ابوالحسن، ازرقی کا ممدوح ہوگا، بہر حال جیسا کہ ذکور ہوا ۴۵۲ھ کے قریب تک شاعر کرمان میں تھا، پھر ہرات آیا ہوگا، چہار مقالہ (مقالۂ دوم، حکایت ششم) سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ہرات میں طغان شاہ بن الپ ارسلان محمد (بن جغری بیگ) احمد بدیہی کے ساتھ نرد کھیل رہا تھا، اور بازی جیتنے کے لیے جب چھکوں کے بجائے دو اکے نکلے تھے، تو وہ سخت برہم تھا، اس وقت ازرقی نے یہ دو بیتی کہہ کر اس کا غصہ فرو کیا:

گر شاہ دو شش خواست دو یک زخم افتاد
تا ظن نبری کہ کعبتین داد نداد
آن زخم کہ کرد رائے شاہنشہ یاد
در خدمتِ شاہ روے بر خاک نہاد

اسی حکایت کے ساتھ طغان شاہ کے ایک ندیم ابو منصور بایوسف کا ذکر ہے، جن سے ۵۰۹ھ میں خود نظامی عروضی نے ہرات میں اس واقعے کے ذیل میں بادشاہ کی داد و دہش کا حال سنا تھا، یہ روایت بھی اس کے ساتھ ہے کہ "پادشاہ بود و کودک بود"، اور چونکہ طغان شاہ کے والد الپ ارسلان کی پیدائش کی سب سے پہلی تاریخ ۴۲۱ھ ہے (راحت الصدور، ص ۱۱۷ح) اس لیے یہ صحیح ہوگا کہ ۴۵۲ھ کے بعد ہی ازرقی نے طغان شاہ کی کودکی" کا زمانہ پایا، بلکہ تاریخ میں تو ۴۵۵ھ سے پہلے طغان شاہ کا ہرات میں ہونا ثابت نہیں، اسلیے کہ معین الدین الاسفزاری کی "روضات الجنات فی اوصاف ہرات" (پنجاب یونیورسٹی لائبریری قلمی ص ۹)

[1] چہار مقالہ مرتبہ ڈاکٹر محمد معین، تہران ۱۳۳۱ شمسی (ص ۷۰) میں پہلے مصرع میں دونوں جگہ "دو" کے بجائے "سہ" کو ترجیح دی ہے۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ الپ ارسلان محمد (۴۵۵ھ/۱۰۶۳ء تا ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء) نے ہرات میں اپنے بیٹے شمس الدولہ طغان شاہ کو والی بنایا تھا یعنی ۴۵۵ھ کے قریب، اسی کتاب میں (ص ۹۳) ہے کہ بعد میں ظہیر الملک ابو منصور سعید بن محمد بن المؤمل نیشاپوری کو والی ہرات بنا دیا تھا، جو الپ ارسلان کی حیات تک رہا، پھر ملک شاہ بن الپ ارسلان کی حکومت (۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء تا ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء) شروع ہوئی تو ایک بار پھر طغان شاہ اسی عہدے پر فائز کیا گیا، لیکن کچھ عرصے کے بعد اس سے بغاوت کے آثار ظاہر ہوئے تو اسے قلعۂ اصفہان میں محبوس کر دیا اور اس کی جگہ نظام الملک طوسی کے بیٹے مؤید الملک ابو بکر عبد اللہ کو والی ہرات بنایا گیا، جو اپنے والد کی شہادت (۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء) تک وہاں رہا، اسکی شہادت کے دو ماہ بعد جب ملک شاہ کی وفات ہوئی تو ہرات میں افراتفری پھیل گئی، ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ۵۰۹ھ میں طغان شاہ کے ندیم ابو منصور بایوسف سے نظامی عروضی کی ملاقات ہرات میں ہوئی تھی، یعنی اس ندیمی کا زمانہ زیادہ سے زیادہ اگر ۴۰-۵۰ سال قبل بھی فرض کر لیا جائے تب بھی وہ ۴۶۰ھ کے لگ بھگ ہوگا، بہر حال اسی زمانے میں ازرقی نے طغان شاہ کی مدح سرائی کی ہوگی:

در سپہرِ حضرت آمد کامجوئی کامراں
از شکارِ خسروی آں آفتابِ خسرواں

آسمانِ داد و ہمت آفتابِ تاج و تخت
نورِ جانِ میر جغری شمع شاہ الپ ارسلاں

مفخرِ سلجوقیاں، سیفِ امیر المومنین
شمسِ دولت، زینِ ملت کہفِ امت شہ طغاں

آخری شعر میں "سیف امیر المومنین" بھی خطاب ہے جو ممکن ہے کہ ممدوح کے اسلاف کی طرح اسے بھی خلیفۂ بغداد سے حاصل ہوا ہو،

ایک اور قصیدے میں بھی یہی ذکر اس طرح ہے:

گوئی کہ ماہ و مشتری از جرم آسماں
تحویل کردہ اند بباغِ خدایگاں

شمسِ دول، گزیدۂ ایام، فخرِ ملک   تیغ خلیفہ، سایۂ اسلام شہ طغان
(دیوان ازرقی ص)

ایک اور قصیدے میں القاب اس طرح آئے ہیں۔

ای شکستہ تیرہ شب بر روی روشن مشتری   تیرہ شب بر روی روشن مشتری در مشتری
بوالفوارس خسرو ایران و توران آن کز وست   از عدو ایام خالی، از فتن مملکت بری
شمس دولت، زین ملت، کہفِ امت شاہِ شرق   مایۂ عدل و ثباتِ ملک و قطب مشتری
(دیوان آصفیہ)

ایک قصیدے سے اس زمانے کی تعیین ہوتی ہے۔

خوش ونکو ز پے ہم رسید عید و بہار   بسے نکوتر و خوشتر ز باد و نہ بیرار
یکے ز جشن عجم جشن خسرو افریدوں   یکے ز دین عرب دین احمد مختار
گزیدہ شمس دول شہریار دین دول   کہ دین و دولت از و گشت جفت عز و فخار
ابوالفوارس خسرو طغاں شہ آں ملکے   کہ شاہی از اثر جاہ اوست بر مقدار

چنانچہ وہ وقت جب عید الفطر اور نوبہار ایک ہی دن ہوں ۴۷۳ھ[1] ہے (۱۵ مارچ ۱۰۸۱ء) ایک اور قصیدے میں اس زمانے کی زیادہ وضاحت ہے۔

چوں چتر روز گوشہ فروز و بہ کوہسار   بر زد و سر علامت عید از شب آشکار

---

[1] ابن الاثیر (جلد دہم ص ۴۴) میں ہے کہ ۴۶۷ھ میں ملک شاہ نے عمر خیام وغیرہ کی کوشش سے "جلالی" سنہ قائم کیا تھا اور (۱۵ مارچ) پہلی فروردین سے وہ سنہ شروع ہوا، ورنہ اس سے پہلے باقاعدگی نہیں تھی، تاریخ بیہقی سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۲۸ھ میں سلخ جمادی الاخری کے بعد (غالباً اپریل ۱۰۳۶ء میں) نوروز ہوا، (ص ۵۲۱)، ۴۲۹ھ میں سہ شنبہ کو جب جمادی الاولی کے ختم کو ۴ دن باقی تھے (یعنی ۱۸ اپریل ۱۰۳۸ء) اس وقت نوروز ہوا، (ص ۵۴۴)۔ ۴۳۰ھ میں چہارشنبہ ہشتم جمادی الاخری (۶ مارچ ۱۰۳۹ء) کو ہوا (ص ۵۶۷) اور ۴۳۱ھ میں پنجشنبہ ۱۸ جمادی الاخری (۶ مارچ ۱۰۴۰ء) کو نوروز ہوا (ص ۶۱۱)

ہر کو کبے بہ تہنیت عید بر فلک   در زیور شعاع برآمد عروس وار
چوں بر فراخت عید علامت بدست شب   نوروز در رسید و علمہاے نو بہار
شمسِ دول طغان شہ زین الامم کزوست   ایام شادمانہ و افلاک بختیار (ایضاً)

اس سال (۴۷۳ھ / ۱۰۸۱ء) کی تعیین سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ازرقی کا تعلق طغان شاہ سے الب ارسلان کے بجائے ملک شاہ کے عہد میں ہوا ہوگا، اور اسی سال کے قریب میں کسی وقت ابو منصور یا یوسف (وغیرہ) اُس کا ندیم رہا ہوگا، جس سے ازرقی کی ملاقات ۵۰۹ھ میں ہوئی تھی،

طغان شاہ کی مدح میں متعدد قصیدے ہیں، چنانچہ ایک پُر رونق باغ اور عمارت کی تعمیر اور آبادی کے وقت لکھا تھا:-

بفال ہمایوں و فرخندہ اختر   بہ بختِ موفق و سعد موقر
بوقتے کہ ہست اندرو فال خوبی   بروزے کہ ہست اندرو سعد اکبر
ببزمِ نو اندر سرائے نو آمد   خداوند فرزانہ شاہِ مظفر
وزیرے کہ جان سخن راست دانش   وزیرے کہ شخصِ سخن راست جوہر
وزیرے کہ پرداخت جائے ہمایے   بہ از قصر کسری و ایوانِ قیصر
بدل ناصح ملک و پیروز دولت   بجاں بندۂ شاہ فرخندہ اختر
(دیوان آصفیہ)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ باغ اور قصر وزیر نے تیار کرایا تھا (شعر ۵) اور وہ علم و فضل (شعر ۴) رکھتا تھا، ایک قصیدے میں اس کے علم و فضل کا ذکر یوں آتا ہے،

ز تابِ عنبر پرتاب بر سہیل یمن   ہزار حلقہ شکست آں نگار حلقہ شکن[1]

---

[1] حدائق السحر (وطواط - مرتبہ عباس اقبال، ص ۴۲) میں ازرقی کی تشبیہات عجیبہ غریبہ کی تعریف آئی ہے

اگر تو تیر جفا را دلم نشانہ کنی
بجان خواجۂ فاضل نگویمت کہ مزن

حکیم سید ابوالقاسم آں کہ شہر سرخس
ز قدر او بہ فلک سر ہمی کشد مسکن
(دیوان آصفیہ)

اس سرخسی وزیر کا پورا نام اور القاب یہ ہے:

بمدح صاحب فرزانہ سید الوزراء
کجا صحیح بزرگیست روزگار سقیم

عماد ملک ابوالقاسم احمد ابن قوام
کہ قیمتی براد حکمت ست و مرد حکیم
(ایضاً)

اس کی مدح میں اور بھی قصیدے ہیں، طغان شاہ کی مدح کے قصیدوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غزنویوں کی طرح اس کے عَلَم میں بھی ہلال تھا اور شعر کی تصویر تھی،

پلنگ و شیر بجنبد بر ہلالِ عَلَم
تن از نسیج یمانی و جاں ز باد شمال

چناں گریزد دشمن کہ شیر رایت او
ز ہیبت تو بجنبد مگر بشکل شگال
(ایضاً)

یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے دینار میں خورشید کا نقش تھا۔

بر کان زر ز دست تو گر صورتے کنند
ز نقش مہر گیرد و بیروں جہد ز کان
(")

اوپر مذکور ہوا ہے کہ ہرات میں ظہیر الملک ابو منصور سعید بن المؤتل نیشاپوری بھی الپ ارسلان کی طرف سے حاکم مقرر ہوا تھا، اس کی مدح میں بھی ازرقی نے قصیدہ لکھا تھا:

بار دیگر بر ستاک گلبنِ بے برگ و بار
افسر زریں بر آورد ابر مرداد و بہار

مفخرِ ملک امین دولت عالی ملک
مرکزِ ملت ظہیر ملک فخر شہریار

منبع احسان سعید ابن محمد کز دلش
مایۂ تدبیر خیزد ہمچو از دریا بخار

لیکن اس کی مدح میں صرف ایک ہی قصیدہ ہے، اس لیے غالباً اس عہد میں (تا وفات الپ ارسلان) ازرقی کو زیادہ موقع نہ مل سکا ہوگا، اور اس کے بعد ہی جب ملک شاہ نے اپنے بھائی طغان شاہ کو والی ہرات بنایا تو وہ اس سے رجوع ہوا، بہرحال جیسا کہ اوپر ایک

قصیدے سے معلوم ہوا، ازرقی ۴۸۴ھ/۱۰۹۱ء تک ضرور زندہ تھا، اور ابتدائی کلام کے پیش نظر، یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی شاعری کا زمانہ کم و بیش چالیس سال رہا ہے، مرزا قزوینی نے (حواشی چہار مقالہ ص ۱۷۷) ازرقی سے منسوب شدہ سند بادنامہ اور الفیہ و شلفیہ سے انکار کیا ہے؛ یعنی وہ دراصل دوسروں کی تصانیف تھیں، اگر وہ سند بادنامہ منظوم بھی کرنا چاہتا تو اس کے لیے دشوار تھا، جیسا کہ طغان شاہ کی مدح میں وہ کہتا ہے:

شہریارا بندہ اندر مدحت فرمانِ تو
گر تو اندر کرد بنماید ز معنی ساحری

ہر کہ بیند شہریارا بندہائے سند باد
نیک داند کاندر و دشوار باشد شاعری

من معانیہائے او را یاور دانش کنم
گر کند بخت تو شاہا خاطرم را یاوری

الفیہ و شلفیہ کے متعلق مرزا قزوینی[1] نے لکھا ہے کہ وہ بھی ازرقی کی تصنیف نہیں ہے، یہ اور بات ہے کہ طغان شاہ کے لیے اس نے (اس کی رجولیت کی کمی کی وجہ سے جیسا کہ تذکروں میں ہے) اسے اپنے الفاظ میں پیش کیا ہو، ازرقی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت عبداللہ انصاری ہرویؒ (م ۴۸۱ھ) کا مرید تھا (آتشکدہ بمبئی ۱۲۹۹ھ ص ۱۴۸ مجمع الفصحاء ج ۱ ص ۱۳۹)

کتابیات

(۱) دیوانِ ازرقی۔ کتاب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد دکن، مخطوطہ نمبر ۹۴۳
(۲) مونس الاحرار۔ از احمد بن محمد بن احمد کلاتی۔ حبیب گنج،

---

[1] قزوینی نے (ص ۱۷۸) بیہقی کے حوالے سے لکھا ہے کہ "صور، تہاے الفیہ" سلطان مسعود بن محمود غزنوی کے لیے ہرات کے ایک قصر میں بنائی گئی تھیں، لیکن "تصاویر و تماثیل" کا ذکر طغان شاہ کے قصر کے سلسلے میں بھی ازرقی نے کیا ہے دیکھیں لباب ۲۔ ص ۸۹

(۳) "روضات الجنات فی اوصاف مدینہ ہرات" از معین الذمجی الاسفزاری
پنجاب یونیورسٹی، لائبریری

(۴) چہار مقالہ از نظامی عروضی، طبع قزوینی، لیدن (ہالینڈ) ۱۳۲۷ھ

(۵) چہار مقالہ از نظامی عروضی، طبع ڈاکٹر محمد معین، تہران سنہ ۱۳۳۱ شمسی

(۶) تاریخ بیہقی، تہران۔ سنہ ۱۳۲۴ شمسی،

(۷) سلجوق نامہ از ظہیر الدین نیشاپوری، تہران سنہ ۱۳۳۲ شمسی

(۸) تاریخ بہرام شاہ غزنوی، از غلام مصطفےٰ خاں، لاہور سنہ ۱۹۵۵ء

(۹) تاریخ افضل۔ مرتبہ ڈاکٹر مہدی بیانی۔ تہران۔ سنہ ۱۳۲۶ شمسی

(۱۰) مجمع الفصحاء۔ تہران۔ سنہ ۱۲۸۵ھ

(۱۱) راحت الصدور، راوندی۔ لندن، سنہ ۱۹۲۱ء

(۱۲) ابن الاثیر۔ طبع لیدن (ہالینڈ)

(۱۳) آتشکدہ۔ بمبئی سنہ ۱۲۹۹ھ

(۱۴) اخبار الدولۃ السلجوقیہ۔ لاہور سنہ ۱۹۳۳ء

(۱۵) لباب الالباب، محمد عوفی۔ لیدن (ہالینڈ) سنہ ۱۹۰۳ء

(۱۶) حدائق السحر۔ وطواط۔ تہران۔ مرتبہ عباس اقبال

(۱۷) المعجم۔ قیس رازی۔ لندن سنہ ۱۹۰۹ء وغیرہ

اقبال کا فوق البشر

از جناب مرزا صفدر علی صاحب لکچرار ورنگل کالج، جامعہ عثمانیہ

اس سے پہلے کہ اقبال کے فوق البشر پر بحث کی جائے یہ ضروری ہے کہ "حقیقتِ انا" "اثباتِ نفس" وجود کائنات اور انسانی انا سے اس کے تعلق پر روشنی ڈالی جائے،

اس بحث میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کائنات کا مادی وجود حقیقت رکھتا ہے؟ اور اس کی حقیقت پر شک نہیں کیا جا سکتا؟ افلاطون کے خیال میں زمان و مکان، مادہ اور علت و معلول کا تسلسل طلسم و خواب سے زیادہ نہیں، اور کائنات مدرکہ کی جو کچھ اصلیت یا شکل یا حسن ہے وہ "تصورات" کی بنا پر ہے، برکلے نے بھی مادے کی حقیقت سے انکار کیا ہے، اس کے نزدیک مادی اشیاء کے وجود کا صرف ادراک ہوتا ہے، لیکن کیا ادراک فریب نہیں دیتا؟ ڈیکارٹ کا قول ہے کہ ضرور فریب دیتا ہے، اور احساس و ادراک اشیا کی حقیقت کو واضح نہیں کرتے صرف اشکال ظاہری دکھا دیتے ہیں۔

فریب احساس و ادراک کی ایک مثال یہ ہے کہ زید اسٹیشن پر رکی ہوئی ریل گاڑی میں ہے، قریب کی پٹری سے دوسری گاڑی گزرتی ہے، وہ اس کی طرف دیکھتا ہے، تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی گاڑی چل رہی ہے، یہ فریب نظر ہے! کبھی کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے اور کوئی نہیں ہوتا، یہ کانوں کا فریب ہے، خواب میں کیا کچھ نہیں نظر آتا جو حقیقت میں نہیں ہوتا، بلکہ اسے ایسے اشکال و واقعات جو کائنات میں نہیں ہوتے یا اس وقت موجود نہیں ہوتے،

خواب میں نظر آتے ہیں، کیا احساس و ادراک کا دھوکہ نہیں ہے؟ ڈیکارٹ کہتا ہے کہ ایسی حالت میں احساس و ادراک کے عمل پر عقل کیسے بھروسہ کر سکتی ہے؟ کیونکہ جو چیز ایک وقت دھوکہ دیتی ہے، وہ کسی وقت بھی دے سکتی،

اس سے فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کائناتِ مدرکہ جسے ہم محسوس کرتے ہیں اور حیاتِ انسانی ایک طویل خواب تو نہیں؟ کیونکہ اس کی حقیقت کا احساس و ادراک بھی ہمیں اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کہ خواب میں اور خواب ایک فریب ہے، لیکن اس کا طلسم اس وقت ٹوٹتا ہے جب ہم بیدار ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح خوابِ زندگانی کا طلسم بھی اس وقت ٹوٹے گا جب ہم اس طویل خواب سے بیدار ہوں گے، غالب کہتے ہیں:

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب سے

ایک فلسفی نے خواب میں دیکھا کہ وہ تیتری بن گیا ہے، بیدار ہونے پر وہ سوچنے لگا کہ حقیقت میں وہ انسان ہے اور اس نے خواب دیکھا کہ وہ تیتری بن گیا ہے، یا حقیقت میں تیتری ہے اور خواب دیکھ رہا ہے کہ انسان ہے، کائنات کے غیر حقیقی ہونے کے متعلق اکثر فلسفیوں اور شاعروں نے لکھا ہے، غالب کہتے ہیں:

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد　　عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

امام غزالی کا خیال بھی یہی ہے،

افلاطون کی طرح اقبال بھی کائنات کو "تصورات" کا ہنگامہ سمجھتے ہیں، اور انھیں بھی مادے کی حقیقت پر شک ہے.

ہستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ من　　چہ زمان و چہ مکاں شوخیٔ افکارِ من است

مادے کی حقیقت پر شبہہ کیا جا سکتا ہے لیکن براڈلے نے وجودِ انسانی ہی کو غیر حقیقی قرار دیا ہے،

ڈیکارٹ کا خیال تھا کہ "میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں" (I Think, Therefore I am) اس کو برٹرنڈ رسل نے اس طرح سمجھایا ہے کہ "میں" جس کا وجود ثابت کیا گیا ہے، اس وجہ سے ہے کہ میں سوچ رہا ہوں، گویا میرا وجود صرف میرے سوچنے تک ہے! اگر میرا سوچنا بند ہو جائے تو میرے وجود کا کوئی ثبوت باقی نہیں رہتا!!" کارل مارکس نے اس قضیے کی تردید اس طرح کی کہ "میں ہوں اس لیے میں سوچتا ہوں" (I am, Therefore I Think) اقبال نے یہ سوال اٹھایا:

اگر گوئی کہ من وہم و گمان است　　نمودش چوں نمودِ ایں و آں است

بگو با من کہ دارائے گماں کیست؟　　یکے در خود نگر آں بے نشاں کیست؟

شک فریب دے سکتا ہے مگر یہ کہنا کہ شک کرنے والا موجود نہیں ہے، اپنی آپ تردید ہے، کوئی چیز فریب دے سکتی ہے، لیکن صرف اس وقت جب فریب کھانے والا موجود ہو، رسل کہتا ہے "کم از کم ایک چیز پر میں شک نہیں کر سکتا وہ یہ کہ میرا وجود ہی نہ ہو کوئی ابلیس کتنا ہی مکار سہی مجھے دھوکہ نہیں دے سکتا" اگر میں سوچتا ہوں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ میں ہوں اس لیے میں سوچتا ہوں ورنہ میں نہ ہوتا تو سوچتا کیوں؟ بہ الفاظ دیگر چونکہ میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں، آگے چل کر رسل کہتا ہے "ممکن ہے میرا کوئی جسم نہ ہو اور یہ محض ایک دھوکہ ہو، مگر خیال ایک دوسری چیز ہے اگرچہ میں ہر چیز غلط سوچوں پھر بھی مجھ سوچنے والے کا وجود ضروری ہے،

ایک بڑے مفکر حلاج نے جب اس کے ہم عصر مفکر شد و مد کے ساتھ انسانی "انا" کی نفی کر رہے تھے، "انا الحق" کا نعرہ لگایا اور اس کو دار پر لٹکا دیا گیا، وہ کہتا تھا کہ "میں "وہ" ہوں جس سے میں محبت کرتا ہوں اور 'وہ' جس سے میں محبت کرتا ہوں 'میں' ہے.

ہم ایک ہی جسم میں دو روحیں ہیں، اگر تو مجھے دیکھتا ہے تو اس کو دیکھے گا۔ اگر اس کو دیکھتا ہے تو ہم دونوں کو دیکھے گا۔" وہ کہتا تھا کہ خدا نے اپنا ایک عکس پیدا کیا، اور اس کو اپنے سارے صفات اور نام دیدیئے، یہ عکس حضرت آدمؑ کی شکل میں نمودار ہوا، جس کو خدا نے اعلیٰ مقام اور اونچا مرتبہ بخشا،

شیخ محی الدین ابن عربی کہتے ہیں کہ انسان صفاتِ الٰہیہ کا ممکن ترین مظہر ہے، اور صرف انسان کے اندر ہے اور اسی کے ذریعے خدا کے تمام کمالات ظاہر ہوتے ہیں، ان کے نقطۂ نظر سے انسان خدا کے تمام اندرونی اور بیرونی صفات کا مظہر ہے، اور صرف اسی کی یہ اعلیٰ ترین صفت ہے کہ وہ خدا کو پوری طرح جان سکتا ہے، بلکہ خدا خود بھی اپنے آپ کو صرف اسی کے ذریعے جان سکتا ہے، کیونکہ وہی خدا کا شعور ظاہر ہے، انسان کے مقابلہ میں تمام موجودات کا علم ناکمل ہے، حتی کہ فرشتوں کا علم بھی خدا کے متعلق ناکمل ہے، ابن عربی کا خیال ہے کہ انسان کے مرتبے اور کائنات میں اس کے مقام کو کوئی شخص اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ وہ خدا پر مکمل طور سے غور کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو اور انسان نہ صرف نائب حق اور عکس ذات بلکہ خود "ذات حق" کہلانے کا مستحق ہے،

ذاتِ انسانی کی حقیقت پر غور کرنے کے بعد کائنات سے اس کے تعلق کو واضح کرنا ضروری ہے۔ ابن العربی کے نزدیک انسان روح کائنات، تخلیق ایزدی کا شاہکار اور کائنات کی افضل ترین شے ہے، کیونکہ سوائے اس کے کوئی اور شے تمام صفات الٰہیہ کی حامل نہیں ہے،

عبدالکریم جیلی نے بھی اپنی کتاب "الانسان الکامل" میں انسان کی حقیقت پر بحث کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ وجود انسانی خود ایک کائنات ہے جس میں ذات خداوندی اور کائنات مادی دونوں نمایاں ہیں، اور وہ دونوں کی اتصالی کڑی ہے، جیلی اور ابن عربی دونوں انسان

کو تخلیق کائنات کا سبب بتاتے ہیں، اور ابن عربی اس کو موجودات عالم کا سرپرست اور نگہبان قرار دیتے ہیں، کیونکہ اگر علت کا خاتمہ ہو جائے تو معلول خود بخود فنا ہو جائے گا،

کائنات کی تمام قوتیں انسان کے زیر فرمان ہیں،

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ	کیا تم لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ جو کچھ
مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ	آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے،
اَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاھِرَۃً	خدا ہی نے یقینی تمہارا تابع کر دیا ہے اور تم
وَّبَاطِنَۃً (سورہ لقمان ۱۹: ۳۱)	پر اپنی ظاہری و باطنی نعمتیں تمام کر دیں'

اقبال کہتے ہیں کہ انسانی خودی تمام کائنات کا شکار کر سکتی ہے،

خودی شیر مولیٰ جہاں اسکا صید زمین اس کی صید آسماں اسکا صید

قدرت کی طرف سے وجود انسانی میں لامحدود اور پراسرار روحانی، دماغی اور جسمانی قوتیں محفوظ کر دی گئی ہیں، اگر ان کا جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوگا کہ "سمندر ہے ایک بوند پانی میں بند"۔ اقبال کے نزدیک عقل ایک غیر معمولی عطیۂ الٰہی ہے،

ہر خاکی و نوری پہ حکومت ہے خرد کی باہر نہیں کچھ عقل خداداد کی زد سے

اس پراسرار قوت کی مدد سے انسان جہانِ رنگ و بو کی تسخیر کر سکتا ہے، اسکو اپنے حسب منشا ڈھال سکتا ہے، اور اپنے مقصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے،

می کند از قوت خود آشکار روزگار نو کہ باشد سازگار

ہر کہ در آفاق گردد بوتراب باز گرداند ز مغرب آفتاب

کائنات کی تسخیر اور اس پر حکومت الٰہیہ قائم کرنا انسان کا فرض اولین ہے، اسے نیابت الٰہی اسی لیے عطا کی گئی ہے، اقبال کہتے ہیں:۔

نائبِ حق در جہاں بودن خوش است　　ہر عناصر حکمراں بودن خوش است

اگر انسان کائنات کی قوتوں کو مسخر نہ کرے تو عناصرِ فطرت اس پر غالب آجائیں گے، اور اس کا عمل بے مقصد اور محدود ہو کر رہ جائے گا، اقبال کہتے ہیں کہ "انسانی قوت کا راز یہ ہے کہ فطرت کے ھیجات کے خلاف مقاومت اختیار کی جائے، نہ کہ اپنے کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ جو موجود ہے اس کی مقاومت اس لیے کرنی چاہیے کہ جو موجود نہیں ہے اس کی تخلیق ہو سکے۔" ان کا خیال ہے کہ "فطرت تو صرف 'ہے' سے زیادہ کچھ نہیں، اس کا منصب 'چاہیے' کے لیے ہماری جستجو کا حجاب بننا ہے۔"

عالمِ رنگ و بو کی تسخیر انسان کا منصب اولین ہے، لیکن اقبال کا فوق البشر صرف اس پر اکتفا نہیں کرتا، وہ طائر لاہوتی ہے، اس کی منزل چرخ نیلی فام سے پرے ہے، وہ 'یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ' کا قائل ہے، وہ خدا کی ذات کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور 'من تو شدم تو من شدی' میں سکون حاصل کرتا ہے، وہ 'من و تو' کے امتیاز کو مٹانے کے لیے خونِ جگر پیتا ہے، ہر ہر قدم پر اہرمن سے نبرد آزما ہوتا ہے، اور اس کو شکستِ فاش دیتا ہے نہ صرف اہرمن سے بلکہ اپنی فطری برائیوں سے بھی برسرِ پیکار رہتا ہے،

مردِ مومن زندہ و با خود بجنگ　　بر خود افتد ہمچو بر آہو پلنگ

وہ خدا مست ہے، اس کا پیکرِ گِل عشق کی مستی سے تابناک ہے اور نغمۂ اللہ اس کی رگ رگ میں سرایت کیے ہے، ایمان و یقین اس کی آنکھوں کا نور اور اس کے دل کا سرور ہے، عشق کی قندیل اس کی زندگی کی تاریک شبوں اور پر ہول وادیوں میں مشعلِ راہ بنتی ہے، جس کی مدد سے وہ ہر زیر و بم سے گزرتا اور سنگِ راہ کو ٹھکرا کر نکل جاتا ہے، وہ "آتش" "صلیب" اور "دار" کے مراحل مسکرا کر طے کرتا ہے، وہ ہر فرعون کے لیے موسیٰ اور ہر یزید کے لیے حسین ہے،

خوف را در سینۂ او راہ نیست　　خاطرش مرعوبِ غیر اللہ نیست

وہ سوائے قوت ایزدی کے کسی اور قوت کے آگے جھکنے کے لیے تیار نہیں، وہ بنائے لا الٰہ ہے،

ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش　　خم نہ گردد پیشِ باطل گردنش

اس کی نظر ہمیشہ افلاک پر ہوتی ہے، وہ آب و گِل کو زیرِ نگیں کرتا ہے، خود اس کے زیرِ نگیں نہیں ہوتا، وہ صفاتِ الٰہیہ کا مکمل مظہر، اعلیٰ اقدار کا سرچشمہ اور اعلیٰ نصب العین کا خالق ہوتا ہے، علو ہمتی، بلند حوصلگی اور وسیع النظری اس کے فطرت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ وہ جہدِ مسلسل کو رازِ حیات سمجھتا ہے،

سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں　　پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں

مردِ سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الٰہ　　سایۂ شمشیر میں اس کی پناہ لا الٰہ

اس کے تنِ فولادی میں دلِ نرم دھڑکتا ہے، اس کی ذات میں جلالی و جمالی دونوں عنصر پہلو بہ پہلو ہوتے ہیں،

پیکرِ نوری نہاد، بندۂ مولیٰ صفات　　ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل　　اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دلنواز

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو　　رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

وہ کشمکشِ حیات میں ہر مخالف قوت سے نبرد آزما ہوتا ہے، لیکن اس کا ہر عمل اللہ کے لیے ہوتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ

ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید　　تیغِ او در سینۂ او آرمید

وہ بنی نوع انسان کا نجات دہندہ، عالم کے لیے سراپا خیر اور زمانے کا مسیحا ہے، وہ جبر کی ہر قید سے آزاد اور تقدیرِ یزداں ہے، اس کی آنکھ خدا کی آنکھ، اس کا کلام خدا کا کلام اور

اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے،

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کارآفریں کارکشا کارساز

وہ اس مقام پر ہوتا ہے جہاں

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

محی الدین ابن عربی نے اپنے فوق البشر کے متعلق بہت جرأت آمیز لہجے میں کہا ہے کہ "صرف دو ہستیاں اپنے آپ کو بجا طور پر خدا کہہ سکتی ہیں، ایک خدا جو اپنے آپ کو اپنی کتابوں میں اللہ کہتا ہے، دوسرے انسان کامل (العبد الکامل)، اب سوال یہ ہے کہ انسان کامل کا کمال کس شے میں مضمر ہے، جس کی وجہ سے وہ وجود باری کی شان سرمدیت میں شرکت کا مدعی ہو جاتا ہے، وہ کہتے ہیں انسان کامل وہ ہے جو وجدانی کیفیات میں اپنی ذات اور حقیقتِ واحد میں ایک ہی وحدت محسوس کرتا ہے، اور اس احساس کے دوران میں اس کا علم اپنے انا، اور ذات حق کے متعلق مکمل ہونے لگتا ہے، ایک اور سوال یہ ہے کہ کیا انسان کامل اپنی ذات (جو صفاتِ الٰہیہ کی مکمل مظہر ہے) کے لحاظ سے یا اپنے علم کی وجہ سے یا وجدانی کیفیات میں ذات باری سے وحدت کے احساس کی بنا پر مکمل ہے (الجمعیۃ الالٰہیہ) ابن عربی ان سب وجوہ کی بنا پر اسے مکمل سمجھتے ہیں، انسان کامل محض اپنی ذات یا اپنے علم کی وجہ سے مکمل نہیں ہوتا، جب تک وہ اپنے "انا" اور ذات باری میں وحدت محسوس نہیں کرتا، عام انسان اور انسان کامل میں یہی امتیاز ہے کہ انسان میں صرف ذات باری کے صفات و کمالات پیدا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اس کے مقابلہ میں انسان کامل میں نہ صرف وہ اوصاف و کمالات موجود ہوتے ہیں، بلکہ اس کا علم بھی مکمل ہوتا ہے، اور وجدانی کیفیات میں اسے پوری طرح ذات باری سے وحدت کا احساس ہوتا ہے،

ابن عربی انسان کامل کے یہ خصوصیات بتاتے ہیں کہ اس کی ماہیت ماہیت ایزدی کے

مماثل ہے، اس کی روح روح کائنات کے مماثل ہے، اس کا جسم کائنات ادبی کے مماثل ہے، (العرش) اس کا علم علم ایزدی کی تصویر یا عکس ہے، اس کا دل الکعبہ کی قدرتی اور اصلی شکل کے مطابق ہے (البیت المعمور) اور اس کی روحانی قوتیں فرشتوں کی سی ہیں، ان کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انسان کامل کی اعلیٰ ترین مثال ہیں۔

اقبال بھی بڑی حد تک ابن عربی کے تصورات سے متاثر ہیں، ان کا فوق البشر ابن عربی کے انسان کامل کی وضاحت کرتا ہے، عبدالکریم جیلی کا انسان کامل بھی ابن عربی ہی کے تصور کی پیداوار ہے،

نٹشے کہتا ہے کہ میں تمھیں فوق البشر بنا سکھاتا ہوں، جس طرح انسان کے آگے گوریلا ایک مضحکہ خیز شے ہے، بالکل اسی طرح فوق البشر کے آگے انسان ایک مضحکہ خیز شے ہے، ایک زمانے میں انسان گوریلا ہی تھا، لیکن اب بھی وہ زیادہ تر گوریلا ہی ہے، ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کے مطابق انسان گوریلے کی ارتقائی شکل ہے، اور نٹشے کے نزدیک فوق البشر انسان کی ارتقائی شکل ہے، وہ کہتا ہے کہ فوق البشر ایک بجلی ہے، جو سیاہ ابر (انسان) سے نکلی ہے، وہ معنئ کائنات ہے، عام انسان اس کو نہیں سمجھ سکتے، وہ سب انسانوں کو مساوی سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ خدا کے سامنے سب انسان برابر ہیں، حالانکہ عام انسان صرف عورت سے ہم آغوش ہونا جانتے ہیں، برخلاف اس کے نٹشے کا فوق البشر کائنات کو اپنے پنجوں میں چیل کی طرح جکڑنا جانتا ہے، وہ اپنے فوق البشر کو پھولوں کی سیج پر نہیں، زندگی کی سنگلاخ گھاٹیوں میں دیکھنا چاہتا ہے، غم واندوہ اور یاس و ناکامی کے گرداب میں نہیں، فتح و کامرانی کی سربلند چوٹیوں پر دیکھنا چاہتا ہے، اس کے قہقہے سننا چاہتا ہے، اس کے آنسو دیکھنا نہیں چاہتا، اسے بت کی طرح ساکن و مبہوت نہیں، جہد مسلسل کرتا دیکھنا چاہتا ہے، وہ اسے طوفان کی طرح

اٹھتا، سیلاب کی طرح پھیلتا اور بجلی کی طرح کڑکتا دیکھنا چاہتا ہے، وہ کہتا ہے کہ "اگر تو اونچے مقام پر پہنچنا چاہتا ہے تو اپنے پیر استعمال کر، دوسرے کے کندھوں پر سوار ہو کر نہ جا، مانا کہ تو گھوڑے پر سوار ہے، اور تیزی سے اپنی منزل کی طرف جا رہا ہے، مگر تیرا لنگڑا پیر تیرے ساتھ ہے، جب تو منزل پر پہنچے گا اور گھوڑے سے نیچے اترے گا تو گر پڑے گا۔" وہ اپنے فوق البشر کو گوشۂ تنہائی میں بیٹھا دیکھنا نہیں چاہتا، کیونکہ اس سے انسان کے اندر سویا ہوا ابلیس جاگ اٹھتا ہے، اور وہ انتہائی نفرت سے بھگتوں اور راہبوں کا مذاق اڑاتا ہے اور کہتا ہے کہ ان لوگوں کا ابلیس ہر بند سے آزاد ہو جاتا ہے۔

چونکہ نٹشے خدا کا منکر تھا، اس لیے اس کے اور اقبال کے فوق البشر میں نمایاں فرق ہے، نٹشے کہتا ہے کہ خدا مر گیا ہے، اور اس کے فوق البشر کے لیے خدا ہی سب سے بڑا خطرہ تھا، صرف خدا کے قبر میں سو جانے ہی سے اس کا فوق البشر جاگ اٹھتا ہے، اور ساری کائنات کا حاکم ہو جاتا ہے، خدا کی موت ہی اس کے فوق البشر کو حیات جاوداں بخش سکتی ہے، اس کا فوق البشر صرف "خواہش زیست" کا قائل نہیں بلکہ اس سے زیادہ "خواہش اقتدار" کا قائل ہے، وہ زندگی حیات میں اعلیٰ اقدار پر نہیں اعلیٰ اقتدار پر عقیدہ رکھتا ہے، وہ اخلاقی اقدار کا غلام نہیں، خالق بننا چاہتا ہے، وہ مذہب و قانون کی زنجیروں کو توڑ کر ہر دقت اور ہر حکومت سے بغاوت کرنا چاہتا ہے، اس کے ہاں اخلاقی اقدار اضافی حیثیت رکھتے ہیں، اور ہر وہ عمل جس سے اقتدار میں اضافہ ہو، اسکے ہاں عین اخلاق ہے۔ وہ مکمل اقتدار رکھنے والے انسان کو اخلاق کی سچی تصویر سمجھتا اور رحم و ہمدردی اور عدل و انصاف کو مریضی ذہنیت کی پیداوار کہتا ہے، مسیحی اخلاق کو غلامانہ تصورات سمجھتا ہے۔ وہ اپنے فوق البشر کے بارے میں آگے چل کر کہتا ہے کہ "مجھے ڈر ہے کہ تو میرے فوق البشر کو شیطان کہے گا۔"

اس کے برخلاف اقبال کا فوق البشر خدا مست ہے، وہ اپنے 'انا' کو ذات حق میں فنا کر دینا مقصد حیات تصور کرتا ہے، وہ بلند ترین اخلاق اور اعلیٰ ترین اقدار کا خالق اور رحم و ہمدردی، عدل و انصاف اور نیکی کا پیکر ہے، اس کی حیات بنی نوع انسان کے لیے رحمتِ یزداں بن جاتی ہے، وہ "اہل عالم را سراپا خیر شو" کا پیغام دیتا ہے۔

یونان کے ایک قدیم مفکر افلاطون نے بھی فوق البشر کے تصور کو پیش کیا ہے، اس کے "آئیڈیل مین" (Ideal man) کا تصور شاید "ہومر" کے اس تصور کی پیداوار ہو کہ "یزدانی عنصر انسان کے اندر موجود ہے۔" افلاطون بشر اور فوق البشر میں یہ فرق کرتا ہے کہ بشر اپنی ذاتی صلاحیتوں اور کوششوں سے اپنی تمام ضروریات کی تکمیل نہیں کر سکتا، اور اس کے لیے چند لوگوں کا محتاج ہوتا ہے، جن کو وہ "حکما" سے تعبیر کرتا ہے، اس کے حکما کا تصور فوق البشر کے مماثل ہے، بنی نوع انسان کی صحیح معنوں میں رہبری کرنا، اس پر حکومت کرنا اور اسے مدد دینا بڑے عظیم اور اہم فرائض ہیں، اس لیے افلاطون کا خیال ہے کہ یہ کام صرف ان لوگوں کے سپرد کرنا چاہیے جن کی صلاحیتیں اعلیٰ ترین ہوں اور جو اس کام کو نیک نیتی، جانفشانی اور مکمل محبت کے ساتھ انجام دے سکیں، ایسے لوگوں کے لیے عالم باعمل اور بلند ذہنیت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اخلاق و کردار کا حامل ہونا، اور علو ہمتی، ضبط نفس اور نصب العین کی سختی سے پابندی ضروری ہے، ان سے خود غرضانہ تصورات اور اقتدار کے غلط استعمال کا صدور نہ ہونا چاہیے، انھیں بنی نوع کی خدمت میں جسم و جان سے محو ہو جانا چاہیے، ان صفات کے حاکم اعلیٰ سچے سپاہی ہوں گے اور انھیں نشۂ اقتدار نہ ہو گا، ان کے لیے صرف قوی، بلند حوصلہ اور جوشیلے ہونا کافی نہیں، بلکہ اہل بصیرت، ژرف نگاہ، ماہر الٰہیات اور فلسفی ہونا بھی ضروری ہے، کیونکہ ایسے ہی لوگ حقائق کو پوری سمجھ سکتے اور خیر و شر میں امتیاز کر سکتے ہیں، اور بنی نوع انسان کے لیے اخلاقی معیار قائم کر سکتے ہیں۔ غرض افلاطون

کا فوق البشر اقبال کے فوق البشر کی ابتدائی شکل ہے،

حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے یونان کے ایک شاعر "ہومر" نے اپنی نظم "اوڈیسے" (Odyssey) میں فوق البشر کا مبہم تصور "آڈیسیئس" (Odysseus) کے روپ میں پیش کیا تھا۔ اس کے بعد ڈانٹے نے اپنی "ڈیوائن کامیڈی" (Devine Camedy) میں ایسا ہی تصور "یولیسیس" (Ulysses) کے کردار میں ظاہر کیا ہے، اسی کردار کو ٹینیسن نے کچھ اضافے کے ساتھ پیش کیا ہے، ٹینیسن کا ہیرو کہتا ہے، "میں سفر سے تھک نہیں سکتا، میں شراب زندگانی کو تلچھٹ تک پی جانا چاہتا ہوں، میں نے خلوت و جلوت میں، ساحل پر اور طوفانوں میں خوشیاں سمیٹی ہیں اور تکلیفیں اٹھائی ہیں، تشنہ روح لیکر کائنات کو چھان ڈالا ہے، ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح علم کا پیچھا کیا ہے، اپنے مد مقابل سے جنگوں کا لطف اٹھایا ہے، میرے لیے ٹھہرنا موت ہے، میرے لیے کشمکش کا اختتام موت ہے، اگرچہ موت ہر چیز کا خاتمہ کر دیتی ہے، لیکن موت سے پہلے ایک اعلیٰ کارنامہ مکمل ہونا چاہیے"۔

زمانہ حال کا مشہور مفکر جارج برنارڈ شا اپنے "بشر اور فوق البشر" (Man and Superman) میں کہتا ہے کہ "انسان میں سب سے زیادہ اہم وہ جزء ہے جس کو ہم اب تک نہیں سمجھ پائے ہیں، بشر کو فوق البشر کی تمنا ہے، اس کا سب سے زیادہ حقیر مجاہد سکندر اعظم ہے، اس کا بادشاہ دنیا میں سب سے پہلا نیک آدمی ہے، اس کا پادری ایک ولی ہے"؛

مولانائے روم نے بھی انسان کامل کے تصور کو پیش کیا ہے، ایک اور قدیم مفکر دیوجانس کلبی نے بھی فوق البشر کی تلاش کی جس کو وہ اس دنیا میں نہ پا سکا، اس مجذوب فلسفی کا ایک پر لطف واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ روز روشن میں یہ چراغ لیکر بازار میں کسی چیز کو تلاش کرتا نظر آیا، کسی نے پوچھا، سورج کی روشنی میں چراغ لیکر کیا ڈھونڈ رہے ہو، اس نے

کہا کہ ایک انسان کو ڈھونڈ رہا ہوں، اس شخص نے پوچھا "کیا تم سورج کی روشنی میں اسکو نہیں دیکھ سکتے؟" اس نے کہا "نہیں! سورج کی روشنی میں بھی مجھے وہ انسان نظر نہیں آرہا ہے"۔ شاید انسان سے اس کا مطلب فوق البشر ہی تھا، مولانائے روم نے اس واقعہ کی طرف چند اشعار میں اشارہ کیا ہے:-

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

زیں ہمرہان سست عناصر دلم گرفت — شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

غرض دیوجانس کلبی نے فوق البشر کی تلاش کی، افلاطون نے عنان حکومت "حکما" کے ہاتھ میں دینی چاہی، نطشے نے پیشینگوئی کی کہ اس کا فوق البشر ارض و سما کا فرمانروا ہوگا۔ مولانا روم نے اپنے "فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر" کی آرزو کی، ہومر، ڈانٹے، ٹینیسن اور برناڈ شا بھی فوق البشر کے متمنی ہیں، اور اقبال نے بھی اپنے "سوار اشہب دوراں" اور "فروغ دیدۂ امکاں" کو بارہا آواز دی ہے،

اسلام کا سیاسی نظام

اگرچہ اسلامی نظام حکومت کے مختلف پہلوؤں پر ادھر بہت سی کتابیں اور بکثرت مضامین لکھے گئے، لیکن جب یہ کتاب لکھی گئی تھی، اس وقت تک اس موضوع پر اردو میں کوئی کتاب موجود نہیں تھی لیکن بعض وجوہ سے اس کی اشاعت کی نوبت اب آرہی ہے، کتاب موضوع کے اعتبار سے بہت جامع، مکمل اور سیر حاصل ہے، اس میں کتاب و سنت کی روشنی میں اسلام کے سیاسی نظام کا اساسی خاکہ پیش کیا گیا ہے اور اسکے ایک ایک جز کی تفصیل کی گئی ہے، شروع میں مولانا عبد الماجد دریابادی کے قلم سے پیش لفظ بھی ہے،

(مؤلفہ مولانا محمد اسحٰق سندیلوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ) قیمت: صہ

منیجر

افریقہ اور اسلام

جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب پروفیسر عربی پنجاب یونیورسٹی

اسلام کا باران رحمت دنیا کے تقریباً ہر حصہ پر برسا ہے اور ہر ایک خطہ نے اپنی اپنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق اس سے فیض پایا ہے، پرانی دنیا کے تین براعظم ہیں، ایشیا، یورپ اور افریقہ، اسلام کو ان تینوں براعظموں کے ساتھ مذہبی، تمدنی اور سیاسی لحاظ سے کم و بیش تعلق رہا ہے، مقالۂ ہذا میں اس بات کو اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ افریقہ اور اسلام کے باہمی تعلقات کے بہت سے دلچسپ پہلو ہیں اور اسلام کی برکت سے افریقہ کے بہت سے باشندوں نے نہ صرف عقائد فاسدہ اور اوہام باطلہ سے نجات پائی ہے، بلکہ مسلمانوں کے میل ملاپ سے ان کی اخلاقی اور تمدنی سطح بھی بلند ہوگئی ہے،

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے، جو نسلی اور قومی امتیازات کو روا نہیں رکھتا، اس لیے اس کا سایہ بہت سی مختلف قوموں کے سر پر رہا ہے، اور اسلامی تہذیب و تمدن کی تعمیر و ترقی میں عربوں کے علاوہ ایرانیوں، ترکوں اور دیگر قوموں نے بھی حصۂ وافر لیا ہے، مگر جہاں تک افریقہ کا تعلق ہے، اسلام کی نمایندگی بیشتر عربوں ہی نے کی ہے، اور سیاسی اور تمدنی لحاظ سے افریقہ کی تسخیر ان ہی کے حصہ میں آئی ہے، مغربی افریقہ میں، اسلام کی توسیع و اشاعت میں بربروں نے بھی حصہ لیا ہے، مگر عربوں کے مقابلہ میں ان کی حیثیت ثانوی ہے۔

اقوام قدیمہ | عربوں کی آمد سے پہلے کئی قدیم قوموں نے افریقہ میں اپنی بساط حکومت بچھائی

تھی، مگر اس براعظم کی آبادکاری میں جو کامیابی عربوں کو حاصل ہوئی وہ اور کسی قوم یا حکومت کو ان سے پہلے نصیب نہیں ہوئی، قدیم مصری لوگ شاہراہ تمدن کی بہت سی منزلیں طے کر چکے تھے، اور ہر لحاظ سے ترقی یافتہ تھے، مگر ان کا اثر و نفوذ وادی نیل سے کبھی آگے نہ بڑھ سکا، اسکندر اعظم کی فتوحات کے بعد مصر میں بطلیموس کے خاندان کی حکومت قائم ہوئی، یہ لوگ یونانی تھے جن کے عہد میں اسکندریہ کے شہر نے سیاسی، تجارتی اور علمی لحاظ سے بے نظیر شہرت اور اہمیت حاصل کی مگر یونانیوں کا دائرہ عمل بھی مصر اور برقہ تک محدود رہا،

حضرت مسیحؑ سے تقریباً آٹھ سو سال پہلے شمالی افریقہ کے ساحل پر موجودہ تونس کے شہر کے قریب فنیقیہ (Phoenicia) کے باشندوں نے ایک نوآبادی قرطاجنہ (Carthage) کے نام سے بسائی، عبرانیوں اور عربوں کی طرح یہ لوگ بھی سامی نسل سے تھے، قرطاجنہ کی سلطنت کئی صدیوں تک قائم رہی، مگر افریقہ کے اندرونی علاقے ان کے حلقۂ اثر سے باہر رہے، یہاں تک کہ رومیوں نے متعدد جنگوں کے بعد آخر کار ۱۴۶ ق م میں قرطاجنہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور قرطاجنہ والوں کی حکومت اور قومی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہوگیا، قدیم قوموں میں سے صرف رومیوں کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ شمالی افریقہ کا بیشتر حصہ ان کی سلطنت میں شامل رہا، مگر ان کی حکومت بھی ساحلی علاقوں تک محدود رہی، ان کے مقبوضات کے جنوب میں صحرائے اعظم تھا، جس میں داخل ہونے یا عبور کرنے کا رومیوں کو کبھی خیال نہ آیا،

مذکورۂ بالا قوموں کے مقابلہ میں عربوں نے افریقہ کی آبادکاری میں اور وہاں کی زندگی پر ہر پہلو سے اثر انداز ہونے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی، اس غیر معمولی کامیابی کے متعدد اسباب ہیں، پہلا سبب یہ ہے کہ افریقہ کے اکثر علاقوں کی آب و ہوا

اور وہاں کے طبعی حالات کو بلاد عرب کی آب و ہوا اور سرزمین سے بہت مشابہت ہے، عربوں کو ان کی بدوی زندگی نے پیشتر سے بادیہ پیمائی کا ایسا خوگر بنا رکھا تھا کہ دیارِ عرب کے یہ شتر سوار جب افریقہ کے حدود میں داخل ہوئے تو ان کی پیش قدمی میں جغرافیائی لحاظ سے کوئی ایسی رکاوٹ پیش نہ آئی، جو ان کے لیے سدِ راہ ثابت ہوتی، اور ان کے حوصلوں کو پست کر دیتی، چنانچہ افریقہ کا شاید ہی کوئی ایسا علاقہ ہوگا جہاں عربوں کے قدم نہ پہنچے ہوں اور ان کی حکومت کا سکہ جاری نہ ہوا ہو،

عربوں کی ملکی فتوحات

مصر کا ملک حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں فتح ہوا، اس تاریخی ملک کی فتح کا سہرا مشہور صحابی حضرت عمرو بنؓ العاص کے سر ہے، جنھوں نے اسکندریہ کی فتح کے بعد برقہ پر بھی قبضہ کر لیا، اس کے آگے طرابلس کا علاقہ تھا، جو حضرت عثمانؓ کے عہد میں فتح ہوا، امیر معاویہؓ کے عہد حکومت میں عربوں نے شمالی افریقہ کے دوسرے ساحلی علاقوں میں پیش قدمی کی، جہاں ان کا مقامی بربری قبائل سے تصادم ہوا، بربر لوگ بھی عربوں کی طرح صحرا نورد، بہادر اور جفاکش تھے، ان کو مسخر کرنے اور اپنا حلیف اور دست و بازو بنانے میں عربوں کے پچاس سال صرف ہوئے، اور انھوں نے اندلس کا شاداب ملک بربروں ہی کے تعاون سے فتح کیا، مگر ہمیں سردست ان کارناموں سے سروکار نہیں جو عربوں نے اندلس کی سرزمین میں سر انجام دیے، بلکہ اس سرگرمی کی طرف مختصر اشارہ کرنا مقصود ہے، جو انھوں نے افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں دکھلائی۔

۵۰ھ میں امیر معاویہؓ نے حضرت عمرو بنؓ العاص کے بھتیجے عقبہ بن نافع کو دس ہزار فوج دے کر بربریوں کی سرکوبی پر مامور کیا، عقبہ بن نافع اپنے نامور چچا کی طرح بڑے باہمت اور صاحبِ عزم تھے، انھوں نے بربروں کو نیچا دکھا کر قیروان کا شہر آباد کیا، اور اسے

خوب مضبوط کر کے عربی حکومت کا مرکز بنایا، چند سال کے بعد یزید بن معاویہ کے عہد میں عقبہ اپنی مشہور تاریخی یلغار پر روانہ ہوئے، اور مغرب کی طرف آگ بگولہ کی طرح بڑھتے ہوئے بحر ظلمات یعنی اوقیانوس کے ساحل تک جا پہنچے، جب خشکی ختم ہو گئی اور عقبہ کو اپنی مزید جولانی دکھانے کے لیے آگے اور کوئی میدان نظر نہ آیا تو انھوں نے کمال تہور سے اپنا گھوڑا پانی میں اتار دیا اور کہا کہ "اگر میرے راستے میں سمندر حائل نہ ہوتا تو میں راہ خدا میں جہاد کرتے ہوئے اور آگے بڑھتا چلا جاتا"۔

جب بحر ظلمات کی وجہ سے عربوں کی پیش قدمی مغرب کی طرف رک گئی تو انھوں نے افریقہ کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا، اس اثنا میں وہاں کے اکثر بربری قبیلے بھی دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے، اور عربوں کے دست و بازو بن چکے تھے، ان کی مشترکہ کوششوں سے اسلام کا قدم مغربی افریقہ میں بڑھا اور سنی گال، آئیوری کوسٹ اور نائیجیریا کے علاوہ تمام مغربی سوڈان اس کے سایے تلے آ گیا،

عربوں کی تجارتی سرگرمیاں

کشور کشاؤں کے بعد عرب تاجروں کی نوبت آئی جو فاتحین کے نقش قدم پر چلے، ایک تجارتی شاہراہ مصر سے چل کر افریقہ کے شمالی ساحل کے ساتھ ساتھ مراکش تک پہنچتی تھی، اس پر قافلوں کی حفاظت کے لیے جابجا چوکیاں قائم ہوئیں، عربوں کے تجارتی قافلے مصر سے چل کر مغرب کا رخ کرتے اور قیروان ہوتے ہوئے مراکش اور اندلس تک پہنچتے، پھر جنوب کا رخ کر کے بحر اوقیانوس (اطلانتک) کے ساتھ ساتھ بربروں کے علاقے سے گزر کر مغربی سوڈان میں وارد ہوتے، مسلمان تاجروں کی آمد و رفت سے ان علاقوں میں اسلام کے ساتھ اسلامی تمدن بھی پھیلتا گیا، یہاں تک کہ مغربی سوڈان کا بڑا شہر تمبکتو (Timbucto) اسلامی تہذیب اور اسلامی علوم کا ایک مشہور مرکز بن گیا، مسلمان حکمرانوں نے یہاں مسجدیں اور مدرسے تعمیر کیے، جہاں سے اسلام کی روشنی دور دور تک

پھیلنے لگی، سوڈان میں مسلمان تاجر مشرق کی جانب سے بھی داخل ہوئے، وہ افریقہ کے اس تمام حصے کو جو صحرائے اعظم کے جنوب میں واقع ہے، بلاد السودان یعنی سیاہ فام لوگوں کا ملک کہتے تھے، لفظ سوڈان اسی بلاد السودان کی بگڑی ہوئی صورت ہے، عرب تاجر افریقہ سے زیادہ تر سونا، تانبا، ہاتھی دانت، آبنوس کی لکڑی اور لونڈی غلام برآمد کرتے تھے،

آپ نے اخبارات میں غانا کا نام پڑھا ہوگا، جسے ۶ مارچ ۱۹۵۷ء کو برٹش کامن ویلتھ کے اندر خود مختار حیثیت دی گئی ہے، غانا بھی مغربی افریقہ کے ان علاقوں میں سے ایک علاقہ ہے، جہاں کئی سو سال ہوئے، اسلام کا قدم پہنچ چکا تھا، غانا کے پایہ تخت کے قریب سونے کی کانیں تھیں اور آس پاس کے ملکوں کے ساتھ خوب تجارت ہوتی تھی، جس سے وہاں کے باشندے بڑے خوش حال ہو گئے تھے، غالبًا اسی لیے بعض عرب مصنفوں نے غانا کو "بلاد الغنا" کا نام دیا ہے، جو ملک کی مرفہ الحالی اور دولتمندی کی دلیل ہے، مشہور عرب جغرافیہ نگار البکری نے اپنی کتاب المغرب فی اخبار المغرب میں غانا کا تفصیلی حال لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے آٹھ سو برس پیشتر مسلمانوں کے قدم وہاں پہنچ چکے تھے، اور ان کی ایک خاصی بڑی آبادی وہاں قائم ہو چکی تھی، اس وقت سے لیکر آج تک اسلام کا اثر و رسوخ وہاں بدستور بڑھتا چلا آیا ہے،

عربوں کی تجارت افریقہ کے مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ بھی پھیلی ہوئی تھی، اس تجارت میں زیادہ تر عمان اور عدن کے عرب حصہ لیتے تھے، ان کی آمد و رفت سے مشرقی ساحل کی بہت سی بندرگاہوں نے فروغ پایا، اور بلاد الصومال سے لیکر موزمبیق تک ان کی بہت سی نوآبادیاں قائم ہو چکی تھیں، ان میں سب سے زیادہ زنجبار نے شہرت پائی، جہاں عمان کے عربوں نے ایک سلطنت قائم کر لی تھی، عربوں نے نہ صرف وہاں کی قدرتی

پیداوار برآمد کر کے ملک کو فائدہ پہنچایا، بلکہ اس کا اقتصادی دولت میں بھی ایک اور طریق سے اضافہ کیا، وہ انڈونیشیا سے لونگ (قرنفل) کا درخت لائے اور زنجبار کے علاقہ میں اس کی کاشت جاری کی، یہ درخت یہاں خوب پھلا پھولا، چنانچہ اس کے باغات آج کل میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں، لاکھوں روپیہ کی لونگ دساور کو جاتی ہے اور ملک کی دولت کو بڑھاتی ہے اور حکومت کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ ہے،

عربوں کی کامیابی کا ایک راز

عربوں کو افریقہ کی سرزمین میں اپنی تہذیب و ثقافت پھیلانے میں جو غیر معمولی کامیابی ہوئی، اس کا ایک قوی سبب یہ بھی ہے کہ وہ ذہنی طور پر نسلی اور قومی امتیازات سے بالاتر تھے، یعنی انھوں نے افریقہ کے اصلی باشندوں کو صرف اس بنا پر کبھی حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا کہ وہ سیاہ رنگ کے ہیں یا غیر نسل سے ہیں، بلکہ وہ جہاں کہیں گئے، مقامی لوگوں کے ساتھ گھل مل گئے، اس فراخدلی اور رواداری کی بدولت ان کو دیگر قوموں کو متاثر کرنے کے بہترین مواقع ہاتھ آئے اور اپنے دنیوی اور دینی مقاصد کے حصول میں وہ خوب کامیاب رہے،

عربوں کی رواداری اور ان کے عدم تعصب کے مقابلہ میں یورپ کی اقوام کا جو سلوک افریقہ کے مقامی باشندوں سے رہا ہے، اس کی ایک مثال اس وقت جنوبی افریقہ میں ہمارے سامنے ہے، جہاں مدرسوں، ہسپتالوں اور ہوٹلوں کے دروازے ملک کے اصلی باشندوں پر بند ہیں، اور قدم قدم پر ان سے نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ بیچارے عام بسوں (Bus) میں گورے لوگوں کے ساتھ سفر نہیں کر سکتے، اور جب وہ اس نسلی امتیاز اور بدسلوکی کی بنا پر بسوں کا استعمال ترک کرتے ہیں تو ان پر اور سختی کی جاتی ہے، اس صورت حالات سے جو قبیح نتائج پیدا ہوئے ہیں وہ کسی تبصرہ کے محتاج نہیں،

عربوں کی اخلاقی برتری افریقہ کی آبادکاری اور وہاں کے باشندوں کو مہذب بنانے اور انکی اخلاقی اور تمدنی سطح کو بلند کرنے میں عربوں کو جو کامیابی حاصل ہوئی، اس کا صرف یہی ایک سبب نہیں تھا کہ وہ اہل افریقہ کی بہ نسبت زیادہ ترقی یافتہ تھے، بلکہ ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ ان کے پاس ایک Ideology تھی، ایک ضابطۂ حیات تھا، وہ ایک خاص مذہب و مسلک کے پابند تھے، جس نے ان کی زندگی میں ایک انضباط (discipline) پیدا کر دیا تھا، اور یہی انضباط زندگی کے ہر شعبہ میں ان کی کامیابی کا ضامن تھا، اسلام ایک مشنری یعنی تبلیغی مذہب ہے، وہ اپنے حلقہ بگوشوں سے اس بات کی توقع رکھتا ہے، بلکہ فریضہ قرار دیتا ہے کہ جو نور ہدایت ان کو ملا ہے، اس کی روشنی دوسروں تک بھی پہنچائیں اور ایمان کی جو دولت ان کے حصہ میں آئی ہے، دوسروں کو بھی اس میں شریک کریں، اس اصول کی بنا پر عرب لوگ جہاں کہیں گئے، اپنا مذہب ساتھ لیتے گئے، اور اس کی اشاعت میں کوشاں رہے، قبول اسلام سے نو مسلم اقوام کی اخلاقی حالت خود بخود بہتر ہو گئی، جن مغربی سیاحوں نے سوڈان اور افریقہ کے دیگر علاقوں کی سیاحت کی ہے، اور وہاں کے حالات کا بذات خود مشاہدہ کیا ہے، انھوں نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ قبول اسلام سے مقامی لوگوں کی کایا پلٹ جاتی ہے، سب سے پہلے عقیدۂ توحید سے ان کا دل و دماغ طرح طرح کے توہمات اور غلط تصورات سے پاک ہو جاتا ہے، اور ان کے اوہام اور غلط خیالات دور ہو جاتے ہیں، جو انکی ذہنی پستی کے موجب تھے، قبول اسلام سے ان کی قبائلی عصبیت بہت حد تک زائل ہو جاتی ہے، اور مقامی بتوں کے مٹنے سے وہ ایک دوسرے کے نزدیک آجاتے ہیں، اور باہمی یکجہتی اور اتفاق کا رشتہ مضبوط ہو جاتا ہے، اور ایک مشترک مذہب کے ساتھ ساتھ تمام قوم میں وحدت پیدا ہو جاتی ہے، اور باہمی مغایرت دور ہو جاتی ہے، نہ صرف جسمانی پاکیزگی کا معیار بلند ہو جاتا ہے،

بلکہ ان کے گاؤں بھی بیشتر کی بہ نسبت زیادہ صاف ستھرے بن جاتے ہیں، جہاں کہیں مسجدیں تعمیر ہوتی ہیں وہ مدارس کا کام بھی دیتی ہیں، جن سے عوام میں لکھنے پڑھنے کا رواج ہو جاتا ہے اور خواندہ لوگوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے، جو طالب علم زیادہ ہونہار یا شوقین ہوتے ہیں، وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بڑے شہروں میں چلے جاتے ہیں، ان کی مجالس میں جو عموماً مساجد میں منعقد ہوتی ہیں، ایک قسم کا خاص وقار پیدا ہو جاتا ہے، جب وہ آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو سلامتی اور امن کا پیغام دیتے ہیں، غرضکہ قبول اسلام کے بعد تہذیب اور شائستگی کے لحاظ سے ان کا درجہ یقیناً بلند ہو جاتا ہے،

اقتصادی منافع عربوں نے افریقہ کو صرف اخلاقی اور روحانی فیض نہیں پہنچایا، بلکہ وہ جہاں کہیں فاتحین یا آبادکاروں کی حیثیت سے سکونت پذیر ہوئے ہیں، انھوں نے وہاں کی قدرتی دولت میں بیش قدر اضافہ کیا ہے، مثلاً سوڈان میں روئی کی کاشت ان ہی کے دم سے جاری ہوئی، جس سے اس ملک کے محاصل بہت بڑھ گئے ہیں، اسی طرح انھوں نے زنجبار کے علاقے میں لونگ کی زراعت کو رواج دیا، جیسا کہ پہلے بیان ہوا، اور اب یہی زراعت وہاں کے باشندوں اور حکومت کی آمدنی کا ایک اہم ذریعہ ہے، اگر اس بارے میں مزید تحقیق کی جائے، تو معلوم ہوگا کہ عربوں نے افریقہ کے مفتوحہ علاقوں میں بہت سے نئے پودوں کی کاشت کو رواج دیکر یا نئی صنعتیں (مثلاً دباغت وغیرہ) جاری کر کے وہاں کے قدرتی ذرائع و وسائل میں بڑا اضافہ کیا ہے، اور وہاں کی اقتصادی حالت کو بہتر بنا دیا ہے،

صدر اسلام کے مذہبی روابط مذکورۂ بالا واقعات اور حقائق سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ تاریخی لحاظ سے یعنی بہ اعتبار زمانہ اسلام اور افریقہ کے تعلقات

بہت قدیم ہیں، اسلام کا پہلا دار الہجرت اور مأمن افریقہ ہی کی سرزمین تھی، جہاں مومنین سابقین کو دشمنوں سے پناہ ملی، اس کی تفصیلات سیرت نبوی کا مطالعہ کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں، ابتدائے اسلام میں جب مشرکین مکہ کی اذیت رسانی حد سے گزر گئی تو رسول اکرم صلعم نے ستم رسیدہ مسلمانوں کو اجازت دیدی، کہ جو لوگ چاہیں چپکے سے سمندر پار حبشہ کے ملک میں چلے جائیں، تجارتی تعلقات کے سبب سے دونوں ملکوں کے درمیان آمد و رفت پہلے سے جاری تھی اور اہل مکہ حبشہ کے ملک اور اس کے راستے سے واقف تھے، وہاں کا عیسائی بادشاہ جو نجاشی کہلاتا تھا، بڑا عادل اور منصف مزاج تھا، مسلمان مہاجرین اس کے ملک میں کئی سال تک امن و امان کے ساتھ مقیم رہے، اور آخر کار جب عرب میں اسلام کا بول بالا ہو گیا تو وطن کو واپس آئے۔

یہ بات بھی سب کو معلوم ہے کہ اسلام کے پہلے موذن حضرت بلالؓ بھی حبشی تھے، اور اس لحاظ سے افریقہ ہی ان کا آبائی وطن اور مولد و منشا تھا، یہ امر بھی بہت دلچسپ ہے کہ امت محمدی کا سب سے پہلا شہید بھی افریقہ ہی کی خاک سے اٹھا تھا، میری مراد حضرت سمیہؓ سے ہے جو ایک سیہ فام لونڈی تھیں، اور حضرت یاسرؓ نے جو یمنی تھے، ان سے شادی کر لی تھی، حضرت یاسرؓ اور ان کی بیوی دونوں اسلام کی عادلانہ تعلیم سے متاثر ہو کر مسلمان ہو چکے تھے، اور اسی جرم کی پاداش میں ابوجہل کے ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے تھے، حضرت سمیہؓ اسی شقی کے ہاتھوں ہلاک ہو گئیں، وہ پہلی شہیدہ ہیں جنھوں نے اسلام پر ثابت قدم رہ کر اپنے دین کی خاطر جان دی، ان کے جلد بعد ان کے شوہر حضرت یاسرؓ نے بھی جام شہادت نوش کیا، ان شہیدان وفا کی داستان بڑی رقت انگیز اور ایمان پرور ہے مگر اس کے بیان کا یہ محل و موقع نہیں، غرضکہ یہ چند ایک خاص امتیازات ہیں

جن پر افریقہ کی سرزمین جتنا بھی فخر و ناز کرے، بجا ہے۔

نتائج

عربوں کی آمد سے افریقہ میں مختلف نوعیت کے بہت سے اہم نتائج پیدا ہوئے، جن کو مختصر الفاظ میں ترتیب وار یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

(۱) سیاسی انقلاب۔ عربوں کی فتوحات سے جو سیاسی نتائج رونما ہوئے وہ بڑے دور رس اور دیرپا ثابت ہوئے، عربوں نے افریقہ کے بہت سے ملکوں کا سیاسی نقشہ کئی صدیوں کے لیے بدل دیا، چنانچہ مسلمان حکمرانوں کے بیسیوں خاندان افریقہ کے مختلف حصوں میں برسر اقتدار آئے، اگرچہ دور حاضر میں مغربی قوموں کے استعمار سے مسلمانوں کا حلقۂ اثر پہلے کی نسبت سے محدود ہو گیا ہے، تاہم اس وقت بھی افریقہ کے متعدد اسلامی ممالک خود مختار حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً مصر، سوڈان، تونس، مراکش اور لیبیا (جس میں طرابلس، برقہ اور فزان کے تین وسیع اضلاع شامل ہیں)

(۲) مذہبی اصلاح۔ عربوں اور مسلمان بربری قبائل نے اسلام کی اشاعت میں جو کوشش کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی، وسطی اور مشرقی افریقہ میں اسلام سب سے غالب مذہب نظر آتا ہے، اور ہر جگہ بت پرستی اور عیسائیت کے مقابلہ میں اب بھی ترقی کر رہا ہے۔

(۳) نسلی تبدیلیاں۔ عربوں نے شمالی افریقہ میں بربروں کے ساتھ اور بلاد السودان میں سیاہ فام لوگوں کے ساتھ شادی بیاہ کا رشتہ قائم کیا جس سے طبعی طور پر مختلف علاقوں میں مختلف درجوں کا نسلی اختلاط پیدا ہوا اور نسلی اور قومی لحاظ سے کئی نئی صورتیں ظہور میں آئیں۔

(۴) لسانی تبدیلیاں۔ عرب فاتحین کے ساتھ ساتھ ان کی زبان بھی آئی، عربوں کے پورے قبیلے اپنے وطن سے اٹھ کر آئے تھے، اس لیے افریقہ کے ایک وسیع حصے پر عربی زبان

چھا گئی اور مقامی بولیاں مٹ گئیں، مثلاً مصر میں وہاں کی قدیم مقامی قبطی زبان آہستہ آہستہ متروک ہو گئی، اور اس کی جگہ عربی نے لے لی، مگر ماحول کی تبدیلی، غیر قوموں کے امتزاج اور دیگر اسباب سے خود عربی زبان بدل گئی، اگرچہ تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان مذہبی اور علمی اغراض کے لیے لغت فصحیٰ کا رواج بدستور باقی رہا، مگر بول چال کی زبان بدل گئی اور مصر، تونس، مراکش اور سوڈان میں مختلف لہجات (Dialects) پیدا ہو گئے، جو نہ صرف لغت فصیحہ (Classical) سے مختلف ہیں، بلکہ آپس میں بھی خاصی مغایرت رکھتے ہیں، یہ اختلاف الفاظ و محاورات، قواعد زبان اور مخارج حروف سب میں پایا جاتا ہے۔

مشرقی افریقہ میں زنجبار کے ساحلی علاقوں میں عربی اور مقامی بولی کے باہمی امتزاج سے ایک نئی زبان معرض ظہور میں آئی جسے سواحلی (یعنی ساحلی بولی) کہتے ہیں۔

(۵) اسلام اور اسلامی تہذیب کی برکت سے عرب لوگ تمدن کے ایک اعلیٰ درجہ پر تھے، ان کے میل ملاپ اور اثر سے دیسی باشندوں کے معاشری، تمدنی، اور اقتصادی حالات بہتر ہو گئے، جیسا کہ صفحات گذشتہ میں اختصار کے ساتھ بیان ہوا، سطور بالا کے مطالعہ سے ناظرین کرام پر یہ امر بخوبی واضح ہو گیا ہوگا کہ "افریقہ اور اسلام" کا موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس کے متعلق ابھی بہت کچھ کہنے سننے کی گنجایش باقی ہے۔

آثارِ تاریخ

مکتوب مولانا شوکت علی مرحوم

بنام

مولانا مسعود علی ندوی

بیتول جیل، بیتول
۱۵ر نومبر ۔۔

اہل ایمان رکھتے ہیں کامل بفتوائے جنون
شانِ "لاخوف علیہم" "شیوۂ" "لایحزنون" (حسرت)

برادر عزیز مسعود۔ السلام علیکم۔ تم کو اس خط کو دیکھکر تعجب ضرور ہوگا اور غالباً خوشی بھی، خاصکر اس لحاظ سے کہ کوئی توقع نہ تھی کہ علی گڈھ کا "کھلنڈرہ" جواب مست تر کھلنڈرہ ہو گیا ہے، دار المصنفین کے "اہل ادب" کو خط لکھے، اور اس کو یہ بھی دعویٰ ہو کہ اس کے خط کو پڑھکر یہ حضرات تھوڑی دیر کے لیے ضرور خوش ہوں گے اور "ادبیت" کو بھول جائیں گے۔ سچ ہے محبت بری بلا ہے اور امتیاز کی دشمن۔

مقام عشق میں شاہ و گدا کا ایک تیور ہے زلیخا ہر گلی کوچہ میں بے توقیر پھرتی ہو

مگر بھائی میں تم کو خفا کرنا نہیں چاہتا اور نہ تم پر جھوٹا بہتان لگانا چاہتا ہوں، تم لوگ اب "اہل ادب" نہیں رہے ہو بلکہ "اسلامی قلی" ہو گئے ہو، اور اپنی بساط کے موافق جو کام کر سکتے ہو وہ کرتے ہو، ہاں

کبھی کبھی ہمارے مخدوم مسٹر عبدالماجد کی صحبت بد کا اثر کچھ پڑ جاتا ہے۔ یہ ان کو دکھا دینا اور میرا سلام اور پیار کہدینا، اگر وہ اس کو قبول کریں، ابھی وہ میرے پیار کے مستحق نہیں ہیں جس دن ہو گئے اس دن ان کا مرتبہ دین اور دنیا دونوں میں بلند ہو جائے گا، دو مرتبہ ملاقات ہوئی مگر وہ بھی محمد علی کی بدولت، محمد علی ہی سے وہ زیادہ مخاطب ہوتے تھے، مگر میں کبھی کبھی صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں فقط محمد علی کا بڑا بھائی نہیں ہوں، بلکہ شوکت علی ہوں، خواہ مخواہ بحث میں حصہ لیتا تھا، میری تقریر کو وہ نہایت اخلاق اور غور سے سنتے تھے، مگر اس کے ساتھ ساتھ "اندرونی تبسم" موجود تھا کہ اس لمبے چوڑے آدمی کو اہل ادب کی گفتگو میں دخل دینے کا کیا حق ہے،

ایک دن بھائی انشاء اللہ ان سے علمی مباحثہ ہوگا اور آپ سب کی موجودگی میں

لاٹ اُس بت کو التجا کر کے ۔۔۔ کفر توڑا خدا خدا کر کے

یہ خط میں نے تم کو لکھا ہے، مولانا سلیمان کو محمد علی کے لیے چھوڑ دیا ہے، وہ ہمیشہ شکایت کرتے تھے کہ جتنے دلچسپ اور پر لطف خط لکھنے والے تھے ان پر میں نے قبضہ کر لیا تھا، اس لیے بہت سے لوگوں سے میری اب صرف علیک سلیک ہے، اور میں بھائی "صاحب شکم" ہوں، اس لیے منتظم "دار المصنفین" میرے کام زیادہ آئے گا۔ ایک صاحب تجربہ کا قول تھا کہ ہر صاحب فہم کو باورچی یا باورچن سے تعلقات قلبی رکھنا چاہیے، ہمیشہ اوپر کا تار ملتا ہے اور نیچے کی کھرچن، برسوں کے بعد جو جھنڈ دارہ میں ملاقات ہوئی تھی، اس سے دل بہت خوش ہوا تھا، سید صاحب کو میرا بہت بہت پیار کہہ دیجئے گا، اور کہیے گا کہ حضرت آپ ہی تنہا نہیں ہیں جو لوگوں کو نظر تعمق سے دیکھتے ہیں، ہم بھی صاحب بصیرت ہیں، بنگلور کی اول ملاقات کا سید صاحب بہت پر لطف تذکرہ کرتے ہیں، خدا کا شکر ہے کہ کالر اور کفوں کا شوق اب نماز میں حارج نہیں ہوتا، مگر بھائی اہل علم بھی کالر اور کفت کے جادو کے اثر سے خالی نہ تھے، میرے جھنڈ دارہ کے سید صاحب بنگلور

کے سید صاحب نہ تھے، جس وقت ان کو اور تم کو دیکھا ایک عجیب قسم کا قلب پر اثر ہوا، خدا کا شکر کیا کہ علم پر جائز گھمنڈ کرنے والا اور ذہین نوجوان اہل ادب غائب تھا، اب تو ایک مست اللہ کا بندہ تھا جس کی ہر ادا سے اور ہر حرکت میں "ما نمی خواہیم ننگ و نام را" کی جھلک صاف نظر آتی تھی، علم، ذہانت اور ادبیت جو خداداد چیزیں ہیں کہیں تھوڑی جا سکتی ہیں مگر ان سب پر اب کلمۂ لا الہ الا اللہ کا تاج رکھا ہوا تھا، جو ان کے حسن کو دوبالا کرتا تھا، آپ صاحبوں کے قلب کی نرمی اور قوت دیکھکر امید کا دریا امڈتا ہے، انشاء اللہ احیائے اسلام میں آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا بڑا حصہ ہوگا، "زہد خشک" بفضلہ تعالیٰ غائب ہو رہا ہے، اب تو عشق کا دور دورہ آتا معلوم ہوتا ہے،

خدا تیرا بت نادان دراز سن تو کیے ۔۔۔ ستم کے تو بھی ہو قابل۔ خدا وہ دن تو کرے

بس بھائی، ہم تو اپنی دھن میں خوش رہتے ہیں، تم باکار ہو اور خدا تم کو اور ہمت اور استقلال دے کہ جو قوتیں آپ سب کو خدا نے دی ہیں، وہ سب اسی کی راہ میں صرف کیجائیں، غالب ہم سب کے پیر مغاں ہیں، خوب فرما گئے ہیں:

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ ۔۔۔ شراب گر نہ ملے، انتظار ساغر کھینچ

محمد علی کا مستقل ارادہ ہے کہ جب خدا کی دی ہوئی آزادی ہم کو پھر ملے گی تو والدہ صاحبہ کی خدمت ضروری سے جلد تر فارغ ہو کر سیدھے اعظم گڈھ آئیں اور وہاں قیام کر کے پوری محنت کے ساتھ اپنی انگریزی کی قابلیت اللہ کی راہ میں صرف کریں، سیرۃ نبوی کو انگریزی جامہ پہنا کر پیام حق کفار یورپ کے کانوں تک پہنچائیں، اور انشاء اللہ ان کے دلوں میں اسلام کا نور پیدا کر کے اس موجودہ بہیمیت سے نجات دلوائیں، خدا ان کو اس بڑے کام کے تکملہ کی توفیق دے اور آپ سب کو اپنی امان میں رکھے، یہ ہماری خوش قسمتی ہو کہ ہم اس

پرلطف زمانہ میں پیدا ہوئے، کیا کیا تماشے نظر آتے ہیں، ابتک تو صرف تماشہ بین رہے ہیں، انشاء اللہ جلد تر خود بھی اپنی لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر کانپتی ہوئی آواز سے اپنا پارٹ ادا کرنے لگینگے، شروع کی ناکامی آیندہ کی کامیابی کی خبر دیتی ہے، خیر جی، کامیابی ہو یا ناکامی، ہم کو تو کام سے غرض ہے، بعض لوگ (میرے خیال میں نادان) کہتے ہیں کہ فضول زندگی جیل میں پڑے ضائع کر رہے ہیں، مگر وہ غلط ہیں، کوئی شخص جو باکار رہنا چاہے کبھی بے کار نہیں رہ سکتا. ہم لوگ بھی اپنا فرض ادا کر رہے ہیں، اور بفضلہ تعالیٰ خوب تر کر رہے ہیں، اپنے مالک کے روبرو اس ۵ برس کی خدمت کو فخر کے ساتھ بیان کریں گے، اور دل گواہی دیتا ہے کہ وہ "بادشاہوں کا بادشاہ" ہماری بدحواسی کے ساتھ بکواس کرنے کو سنکر خوش ہوگا، اور اس کے صلہ میں زندگی بھر کے لاکھوں گناہوں اور فسق و فجور کو معاف فرما دے گا، مسکرا کر فرمائے گا "تم ہر حال میں مجھ سے راضی تھے، ہم بھی تم سے راضی ہیں"، اللہ اللہ اتنی بڑی نعمت کے بدلے اگر انسان کی لاکھ جانیں بھی ہوں تو وہ قیمت میں کم ہیں، اقبال کو پڑھ کر دل خوش ہو جاتا ہے، ہماری تشفی کے لیے خوب لکھدیا ہے.

نہیں بے وجہ وحشت میں اڑانا خاکِ زنداں کا
کہ میں اس خاک سے پیدا بیاباں کرکے چھوڑونگا

خدا کا شکر ہے کہ اصلی مالک کی غلامی میں آجانے کے بعد اب قلب میں باوجود لاکھوں کمزوریوں کے ایک عجیب کیفیت پیدا ہو گئی ہے، کوئی دنیا کی بڑی سے بڑی جابر اور باعظمت و بارعب ہستی آنکھ میں نہیں جچتی ہے.

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا

انشاء اللہ رفتہ رفتہ اس جنون میں اور پختگی پیدا ہوگی، یہانتک کہ فرزانگی میں بھی ہم لوگ فرد ہو جائیں گے. حسرت سے تم لوگوں کی ملاقات ہے یا نہیں، خوب شان کا آدمی ہے، اور

اس کی زندگی پر رشک آتا ہے، کیا خوب لکھا ہے:

سب سے منہ موڑ کے راضی ہیں تری یاد سے ہم
اس میں اک شانِ فراغت بھی ہے راحت کے سوا

میں بھی انشاء اللہ اعظم گڈھ آؤں گا اور تم لوگوں کا وقت ضائع کروں گا، سید صاحب سے کہدینا کہ اس مجلس میں "یارانِ مجلس" میں ان کی سیرۃ نبوی بھی شامل ہے، میرے سامنے میز پر ایک جلد رکھی ہے، اہل ادب نہیں ہوں اسلیے اسی وقت پڑھتا ہوں جب دل اس کے لیے تقاضا کرتا ہے، پڑھتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں اور روتا ہوں، دعا کرتا ہوں کہ خدا ہم کو حضرت بلال رضؓ کا سا ہی ایمان عطا فرمائے، وہ غریب غلام، ابن غلام تھے، حبشی تھے اور غالباً بدمنظر۔ میں خاندانی آدمی ہوں، علی گڈھ کا بی اے ہوں، گورنمنٹ انگریز کے یہاں بڑے عہدے پر ملازم تھا، اور نہایت نیک نام اور ہر دل عزیز تھا، مگر ہماری ایسی کہاں قسمت، ہم تو ان کے پانوں دھونے کے قابل بھی نہ تھے. کبھی ملاقات ہوگی تو اقبال کا قصیدہ آپ کو سناؤں گا، اگر اس وقت دل میں خلوص ہوا تو مست ہو کر آپ سب کو بھی دیوانہ بناؤں گا، کیا خوب لکھا ہے،

"بلال"

(۱) چمک اٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا — حبش سے تجھکو اٹھا کر حجاز میں لایا
(۲) ہوئی اسی سے ترے غمکدے کی آبادی — تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی
(۳) وہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایک دم کے لیے — کسی کے عشق میں تو نے مزے ستم کے لیے

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزہ ہی نہیں

گر وہ مرد تھے اور ہم لوگ .... خدا رحم کرے، کاش حضرت لبیدؓ کی سی جرأت اور ہمت ہوتی، خدا آپ سب کو زندہ اور سلامت رکھے، اس سلسلہ کے ذریعہ سے لاکھوں مسلمانوں کے ایمان کو تازہ کیجئے گا، سید صاحب کو چھوڑ دو۔ مسعود ایک چھوٹا سا مولود شریف تیار کرو جس میں ۱۲ مجالس کے لیے سامان ہو، عام فہم، مختصر مگر صحیح حالات، عام مسلمانوں کے فائدے کے لیے اور جس میں بہت سی عمدہ نظمیں ہوں، ہر مسلمان کی تصنیف میں سے جس قدر چوری ہو سکتی ہے چرا دُ، عبارت بھونڈی ہو تو کچھ فکر نہیں، "ادبیت" کے لحاظ سے کتاب گری ہوئی ہو تو کچھ پرواہ نہیں، بعد کو کوئی خدا کا بندہ پیدا ہو جائے گا جو اس کو درست کر دے گا، یا اس میں اضافہ کر کے بہترین مولود شریف تیار کر لے گا، ہم لوگ اس قدر بھوکے ہیں اور فاقہ سے خستہ حال کہ جب تک دکاندار بہترین خوان نعمت ہماری شان کے مطابق تیار کرے ہم مرجائیں گے، بدرجہا بہتر کہ اس عرصہ میں کچھ غذا تو مل جائے۔ میں نے ہندوستان کے تمام اخبارات سے کاٹ کر ان ۵ برس میں تقریباً ایک ہزار نظمیں جمع کی ہیں اور اب بھی جمع کرتا ہوں، رطب و یابس سب طرح کی ہیں، مگر بالکل ردی چھانٹ دی ہیں، صرف اپنے مطلب اور مذاق کی رکھ لی ہیں، انشاء اللہ ان کو انتخاب کر کے شائع کر دوں گا، ان میں سے بہت سی آپ کے کام آئیں گی، جو میں چاہتا ہوں وہ آسان کام ہے، ایک ڈھانچہ تیار کر لیں گے، بعد کو اضافہ ہو سکتا ہے، تم احباب سے اس کا تذکرہ کرنا، بہت آسانی سے عمدہ چیز تالیف ہو جائے گی۔

ہماری زندگی پرلطف ہے، تم کو ہنسی آئے گی کہ میں اس مجلس کا امام ہوں، جمعہ کے روز محمد علی کی بھاری آواز سے تمام عمارت اللہ اکبر کے نعرے سے گونج جاتی ہے، ایک کرسی پر جانماز بچھا کر منبر تیار ہو جاتا ہے، خطبہ پڑھتے وقت مجھ پر رعب طاری ہوتا ہے،

تم کو علم ہے کہ تقریر کرنا مجھے کچھ زیادہ گراں نہ معلوم ہونا چاہیے، مگر اس وقت الفاظ منہ سے نہیں نکلتے، گھبرا گھبرا کر دعائیہ کلمات ادا ہوتے ہیں، سننے والا بعض وقت ہنسے گا، بعض وقت جھجھر جھری کھائے گا، اور کبھی کبھی رو بھی دے گا، محمد علی مقتدی ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ہمارا خانساماں بھی، قرآن پاک کے موجود ہوتے ہوئے کسی اور کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی، مگر ہم لوگ خوش قسمت ہیں، ہر طرح کی کتابیں پڑھنے کو ملتی ہیں، تقریباً ۱۵، یا ۱۶ اخبار آتے ہیں، سارے ہندوستان کی خبریں ہم سے زیادہ تم کو معلوم ہوں گی، کلام شعراء سے دل خوش ہوتا ہے، غالب، حسرت، اقبال، سیرۃ کے ہم بغل میرے سرہانے موجود ہیں، ایسے آلات کی موجودگی میں ہم مست اور خوب نہ ہوں تو کون ہو بھائی میں شاعر نہیں، مگر شاعروں کے کلام پر جان فدا کرنے والا ہوں، نہیں مگر اپنے خیال والے مست اہل ادب کا سچا قدردان، کیونکہ رقابت کا یہاں کھٹکا ہی نہیں، مایوسی پاس نہیں آنے پاتی اور مایوس ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں، ہم لوگ بہت آہستگی اور بددلی کے ساتھ مگر پھر بھی ضرور صراط مستقیم پر آرہے ہیں، اس مالک حقیقی سے توقع ہے کہ وہ ہماری بے بسی اور بے بضاعتی پر رحم فرمائے گا، اور ہم کو ارادوں میں مضبوطی اور ثبات قدم عطا فرمائیگا، انشاء اللہ قدم آگے ہی کو بڑھے گا، محمد علی کی ذیل کی نظم غالباً آپ نے نہیں دیکھی ہوگی، یہ اس سال ہی چھندواڑہ میں فروری میں لکھی تھی، اور اس کی شان نزول بھی دلچسپ ہے، ہمارے بڑے بھائی مسٹر ذوالفقار علی خاں گوہر جو محکمہ آبکاری میں افسر ہیں، اور اب بڑے مرتبہ کے قادیانی ہیں (مرزا محمود احمد کی پارٹی میں) شاعری میں بہت اچھا مذاق رکھتے ہیں، اور داغ مرحوم کے شاگرد ہیں، نوعمری میں ان کی صحبت میں رہتے تھے، جبکہ وہ رام پور میں مقیم تھے، اور ہمارے خاندان سے خاص تعلقات تھے، محمد علی سے ان کو بچپن سے بہت محبت تھی، اور ان کے ساتھ ساتھ یہ حضرت بھی داغ کی خدمت میں جاتے تھے، اور ان کے پیٹ پر بیٹھ کر اشعار سنتے تھے،

بھائی کے بھی محمد علی شاگرد تھے، اور اسی لحاظ سے جوہر تخلص رکھ کر ان کے "ہم قافیہ" ہو گئے،
ہماری نظربندی میں بھائی غریب مجبوراً ہم سے مل نہ سکتے تھے، اور محمد علی نے اس کی شکایت
ان کو لکھی تھی، ان کے سامنے اس زمانہ میں بہت اور دشواریاں پیش تھیں، ایک غزل لکھ بھیجی
جس کو معذرت منظوم کہنا چاہیے، خوب لکھی تھی، اس کا مطلع پڑھ کر محمد علی کو بھی جوش آگیا اور قافیہ
بدل کر ذیل کی غزل لکھی اور خوب لکھی، بھائی کا مطلع یہ تھا،

جورِ اعدا کے گلے، تیری جدائی کے گلے — اس دلِ تنگ میں ہیں ساری خدائی کے گلے

(مسٹر ذوالفقار علی گوہر)

کبھی چکھے ہی نہیں آبلہ پائی کے مزے — خضر کیا جانے بھلا راہ نمائی کے مزے
کثرتِ شوق سے تھا ہجر میں ہم رنگِ وصال — ہم نے لوٹے ہیں بہت تیری جدائی کے مزے
طبعِ آزاد اسیری میں بھی پابند نہ تھی — قید میں ہم نے اٹھائے ہیں رہائی کے مزے
میری مرضی ہوئی گم جب سے تری مرضی میں — بندگی ہی میں ملے ساری خدائی کے مزے
کششِ شوق تھی اور لذتِ بُعدِ منزل — ہر طرف خار تھے اور آبلہ پائی کے مزے
آگئی وادیِ پُرخار، بڑھاؤ تو قدم — پھر نہ کہنا، نہ ملے راہ نمائی کے مزے
سمجھے ہر سجدہ کو معراج جو زاہد چکھ لے — در توبہ پہ مری ناصیہ سائی کے مزے
شعر جوہر کی ہو کیا قدر سخن سازوں کو — ہم سے پوچھے کوئی اس ہرزہ سرائی کے مزے

غالباً آپ نے کلام جوہر نہیں دیکھا، دہلی میں طبع ہوا تھا، نقیب والی غزل اس میں شائع
ہو گئی ہے، میں محمد علی کو اشتعال دے رہا ہوں کہ کچھ اور لکھے، والدہ صاحبہ کی بیماری کی خبر سے دل کو
بے چینی ہو گئی ہے، ان کی تندرستی نہایت عمدہ تھی، مگر اس زمانہ کے واقعات نے اثر کیا اور روزمرہ کے
ہیجانات نے عمر میں ایک برس کا اور اضافہ کر دیا، ابتدا سے وہ ہمارے ساتھ ہیں، اور وہیں خوش

رہتی تھیں، جب ہم یہاں لائے گئے تو ان کو قیام کی ممانعت کی گئی، وہ کب راضی ہوتیں، مگر ہماری
قسموں کی تعمیل کی اور اس بات کی وجہ سے بھی کہ شاید ہم پر اس انکار کا خراب اثر ڈالا جائے،
وہ رام پور چلی گئیں، اب عید پر ملنے تشریف لائی تھیں، ہمت مردانہ وہی تھی، مگر نہایت درجہ
ان ۳ ماہ میں کمزور ہو گئی تھیں، بعد کو ان کی رفیق ملازمہ سے معلوم ہوا کہ وہ دودھ جو ان کی غذا
اور دوا دونوں تھا، قطعی ہم سے جدا ہونے پر ترک کر دیا تھا، تقاضے سے خفا ہو جاتی تھیں،
فرماتی تھیں کہ جب تک میرے بلانے والے میرے پاس نہیں ہوں گے، اس وقت تک نہیں
پیونگی، اس کے علاوہ اس دن سے پلنگ پر سونا چھوڑ دیا تھا، ہمارے پاس آکر اول مرتبہ
دودھ پیا اور پلنگ پر لیٹیں، اور ہمارے کہنے پر وعدہ کر لیا کہ اب آئندہ ہماری خواہش پوری
فرمائیں گی، مگر از حد پژمردہ اور کمزور تھیں، اصرار کر کے تمام بزرگوں کے مزاروں پر واپسی میں
فاتحہ پڑھنے گئیں، اجمیر شریف، آگرہ، دہلی، سرہند شریف، اور پیران کلیر شریف ہوتی ہوئی
رام پور پہنچیں، راستہ ہی سے بخار آگیا تھا، اس کے بعد آنتوں میں ورم پیدا ہو گیا، اور یرقان
کے آثار تھے، علاج ہو رہا ہے، اور اب پہلے سے افاقہ ہے، درد اور تکلیف کم ہے، مگر کمزوری
بدستور موجود ہے، ہماری یاد ہر وقت رہتی ہے، اگست میں ہم نے درخواست کی تھی کہ ہم کو یا تو
بالکل آزاد کیا جائے، ورنہ ہم کو روزے کے زمانہ کے لیے رام پور میں رکھا جائے اور جو شرائط
نواب صاحب بہادر سے طے پائیں ہم کو منظور ہوں گی، ۵ ماہ کے بعد ہم پھر یہاں واپس
چلے آئیں گے، گمان غالب تھا کہ ہم ستمبر میں وطن چلے جائیں گے، اور یہاں کے ڈپٹی کمشنر
سابق نے یقین دلایا تھا کہ عنقریب ہمارے احکام آتے ہوں گے، مگر نہ معلوم وہ کیوں
ملتوی کر دیے گئے، جب اکتوبر میں ان کی علالت کا حال معلوم ہوا تو پھر ہم نے بذریعہ تار
یاددہانی کی، اور عارضی طور پر جانے کی درخواست کی، والدہ صاحبہ نے بھی بذریعہ حضور نواب

درخواست دی، تار گیا، ۴ دن کے بعد ڈاکٹری سرٹیفکٹ طلب کیا گیا، وہ بھی بھیجا دیا، مگر ہنوز روز اول ہے، چیف کمشنر ۵ نومبر کو یہاں بیتول آئے تھے، فقط ہم سے ملے، جیل میں بھی آئے، اس مہینہ کے قیام میں ہم نے ان کو ہمیشہ اچھا پایا تھا، انھوں نے اپنی معذوری بیان کی کہ وہ فقط جیلر تھے، اور ان کے تمام ضلع کے آدمیوں کو حکم تھا کہ ہم کو ہر قسم کی آسایش پہنچائی جائے، گفتگو اور صاف گفتگو کا ان پر اثر پڑا، اور انھوں نے ہم سے کہا کہ آپ آج ہی مختصراً مجکو لکھ دیجئے کہ آپ کیا چاہتے ہیں، ہم نے اطلاع دیدی ہے کہ اول تو ہمکو آزاد کیا جائے، کیونکہ شروع سے ہماری سلب آزادی ناجائز تھی، اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو ہم کو رامپور قیام کی اجازت ہو تاکہ ہم کاروبار روئی کو دیکھیں بھالیں، اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو ہم کو عارضی طور پر رامپور میں قیام کی اجازت ہو کہ والدہ صاحبہ کی تیمارداری کریں اور بعد صحت ان کو یہاں لے آئیں، ہم جیل میں رہیں اور وہ باہر، مگر ہم سے ملتی رہیں، یہ درخواست اس قدر معقول تھی کہ انھوں نے اس کو گورنمنٹ ہند کے پاس بھیجدیا، اب تک جواب نہیں آیا ہے، خدا والدہ صاحبہ کو تندرست کردے، تاکہ ہم ان کی کوئی خدمت کرسکیں، اب تک تو انھوں نے ہی ہماری خدمت کی ہے، خط بہت لمبا ہوگیا، اب ختم کرتا ہوں، سب کو سلام اور پیار،

آپ سب کا دعاگو

شوکت علی، خادم کعبہ

یہ خط ضائع نہ کیجئے گا،

ادبیات

نسیمِ دیارِ نبی زندہ باشی

از جناب زائرِ حرم حمید صدیقی

نسیمِ دیارِ نبی زندہ باشی — پیامِ سُرور و خوشی زندہ باشی

بیا دوستدارِ غلامانِ طیبہ — بیا محرمِ زندگی زندہ باشی

برآر آرزوے نگاہِ محبان — بیالے مرادِ دلی زندہ باشی

براہِ محبت مرا زندہ کردی — بہ رسمِ وفا پروری زندہ باشی

ہزاراں ہزار آفریں بر خرامت — خوشا زحمتِ رہبری زندہ باشی

قدومت مبارک پیامت مبارک — یہ دلداری و دلدہی زندہ باشی

انیسِ دلِ دردمندانِ طیبہ — خوشا تیری یاد آوری زندہ باشی

زہے دلنوازی زہے چارہ سازی — مبارک تری ہمدمی زندہ باشی

مسیحائے درماندگاں بارک اللہ — شمیمِ ریاضِ نبیؐ زندہ باشی

کیا دردمندوں پہ احسان تو نے — خوشا تیری چارہ گری زندہ باشی

نہ بھولے گی ہم اہلِ غم کو کبھی تو — یہی تجھ سے امید تھی زندہ باشی

دکھا کر جھلک تو نے نورِ سحر کی — شبِ غم کو دی روشنی زندہ باشی

مرے دردِ غم پر مری چشمِ نم پر — نوازش بہت تو نے کی زندہ باشی

بہار آگئی میرے اجڑے چمن میں بنی پھول دل کی کلی زندہ باشی

سنائی جو تو نے طلب کی بشارت سنی گوشِ دل سے سنی زندہ باشی

مرے دل کو دے کر نوید مسرت نئی زندگی بخشدی زندہ باشی

بہت دن سے تھا دل کو شوقِ حضوری بڑی رہبری تو نے کی زندہ باشی

میں قربان تجھ پر کہ تیری بدولت ملی دولتِ سرخوشی زندہ باشی

حمید گنہگار پر، اللہ اللہ
یہ تیری کرم گستری زندہ باشی

شمعِ جہان سید و سرور صلی اللہ علیہ وسلم

از ڈاکٹر ظہور الحسن شارب، ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، ایڈوکیٹ ہائیکورٹ

شمع جہانے سید و سرور صلی اللہ علیہ وسلم رونقِ بستاں دین کے رہبر صلی اللہ علیہ وسلم

نور ہدایت، ماہ طریقت، مہر نبوت، راز حقیقت آیۂ رحمت ساقی کوثر صلی اللہ علیہ وسلم

نور مقدم مشفق اعظم، شاہ معظم، رحمت عالم مونس و ہمدم محسن اکبر صلی اللہ علیہ وسلم

مصطفٰے جانے شیریں مقالے، دشمن دلیلے فخر خلیلے اعلیٰ و افضل، بہتر و برتر صلی اللہ علیہ وسلم

بدر التمامے افصح کلامے، اعلیٰ مقامے، در یتیمے حامیِ امت شافعِ محشر صلی اللہ علیہ وسلم

قبلۂ دینے کعبۂ جانے، سدرہ مقامے، مہر جہانے فتح نشانے ناصر و یاور صلی اللہ علیہ وسلم

چشم سیاہے، جادو نگاہے، گیسو درازے، بندہ نوازے رہبر عالم طاہر و اطہر صلی اللہ علیہ وسلم

فخر زماں ہو، جانِ جہاں ہو، عقدہ کشا ہو، حاجت روا ہو
ادنیٰ غلامے شاربِ کمتر صلی اللہ علیہ وسلم

مطبوعات جدیدہ

اسوۂ حسنہ۔ از مولانا صفوۃ الرحمٰن صاحب صابر مدیر الحق، تقطیع بڑی، ضخامت ۲۴۶ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ ادارہ اہل سنت و جماعت کمان سلطان شاہی، حیدر آباد دکن نمبر ۲،

اردو میں سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑا ذخیرہ فراہم ہوگیا ہے، لیکن "نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں"۔ اس لیے ہر لکھنے والے کو سیرت پاک کے کچھ نہ کچھ ایسے امتیازی پہلو مل ہی جاتے ہیں جن کو نمایاں کرنے کی ضرورت اس کی نگاہ میں باقی ہوتی ہے، اس لیے نور و ہدایت کا یہ سرچشمہ برابر جاری ہے، اسوۂ حسنہ بھی اسی قسم کی ایک نئی سیرت ہے جس میں مصنف کے بقول "دنیا سے بے رغبتی، آخرت کی خیر و ابقی، زندگی کی طلب و حرص، بگڑی ہوئی دنیا کو سنوارنے کی جد وجہد، انسانوں کو اوصاف انسانیت سے آراستہ کرنے کی تعلیم اور جہاد فی سبیل اللہ کے باطل شکن عزائم" کو زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں نبوت کی ضرورت و اہمیت، ایمان بالرسالت، بعثت نبوی کے وقت عرب کی حالت وغیرہ پر بحث کی گئی ہے، اس کے بعد ولادت نبوی سے لیکر آپ کی وفات تک کے واقعات اخلاق و شمائل نبوی، ازواج مطہرات و اولاد امجاد وغیرہ کا تذکرہ ہے، اور آخر میں کلام مجید اور احادیث نبوی سے اسلام کی اہم تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے، اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ سیرت پاک کے واقعات کو اس طرح پیش کیا گیا ہے جس سے زندگی کے مختلف پہلوؤں

میں اسوۂ نبوی سامنے آجاتا ہے، جابجا صحیح اسلامی عقائد کی توضیح اور بدعات و محدثات کی
تردید بھی کی گئی ہے، اسلیے یہ کتاب سیرت نبوی بھی ہے اور صحیح اسلامی عقائد و خیالات کا درس بھی۔

ظفر علی خاں ۔ مؤلفہ جناب شورش کاشمیری، تقطیع بڑی، ضخامت ۳۰۰ صفحات
کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد للعہ، پتہ مکتبہ چٹان نمبر ۸۰ میکلوڈ روڈ، لاہور۔

یہ کتاب مولانا ظفر علی خاں کے حالات میں ہے، مگر سوانح عمری کے مالوف طرز پر نہیں ہے،
بلکہ صاحبِ سوانح کی زندگی کا ایک خاکہ ہے جس میں مصنف کے شوخ قلم نے اس طرح رنگ
بھرا ہے، جس سے صاحب سوانح کے تمام خط وخال اور اس کی خصوصیات نمایاں ہوجاتی
ہیں، مولانا ظفر علی کی شخصیت بڑی ہمہ گیر تھی، وہ اپنے زمانہ کے نامور صحافی، سرفروش لیڈر،
شعلہ بیان خطیب، سحر طراز ادیب اور قادر الکلام شاعر تھے، ان کے قلم اور زبان دونوں
میں بلا کا زور تھا، ان کی زندگی بڑی ہنگامہ خیز تھی، ہر تحریک میں پیش پیش رہتے تھے، اور بعض
تحریکوں کے خود بانی تھے، ملک وملت کی راہ میں ان کی بڑی قربانیاں ہیں، وہ تنہا ایک عالم تھے،
ان خوبیوں کے ساتھ ان میں کمزوریاں بھی تھیں، طبیعت میں بڑا تلون تھا، عرصہ تک ایک مسلک
پر نہ رہتے تھے جس سے اختلاف ہوتا اس کی مخالفت میں پورا زور صرف کردیتے، اور اسمیں
اعتدال سے گذر جاتے، اس لیے ان کی خصوصیات کا دکھانا آسان نہیں تھا، مگر یہ کام ایک
ایسے شخص کے ہاتھوں انجام پایا جس نے برسوں ان کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور جو ان کی
زندگی کے ہر رخ سے پوری طرح واقف ہے، اس کے قلم میں بھی زور ہے، اس لیے اس خاکہ سے
ظفر علی خاں کی پوری تصویر، ان کی خصوصیات اور کارناموں کے ساتھ ہندوستان کی
گذشتہ نصف صدی کی ملکی وملی سرگذشت بھی نگاہ کے سامنے آجاتی ہے۔

زبان اور علم زبان ۔ مؤلفہ پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ

تقطیع بڑی، ضخامت ۳۱۶ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد عہ
پتہ: اردو ہال حمایت نگر، حیدرآباد دکن

پہلے لسانیات کا فن، زبانوں کی تاریخ، ان کی تقسیم، ان کے باہمی تعلق اور انکی لسانی تحقیق
تک محدود تھا، مگر اب وہ ایک نہایت وسیع علم ہوگیا ہے، اور اس کے بہت سے نئے پہلو پیدا
ہوگئے ہیں، اور ان کی تحقیقات کا سلسلہ برابر جاری ہے، اس کی تعلیمی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے،
اور مغربی زبانوں میں اس پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مگر اردو میں بہت کم لکھا گیا ہے جو کچھ لکھا بھی گیا ہے
وہ لسانیات کی موجودہ ترقی کے مقابلہ میں نہ ہونے کے برابر ہے، اور اب ہندوستان میں بھی اسکی
تعلیمی اہمیت بڑھتی جاتی ہے، اس لیے لائق مصنف نے اس موضوع پر اردو میں یہ جامع کتاب لکھی ہے،
جو لسانیات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے، راقم کو اس فن میں درک نہیں ہے، اس لیے وہ فنی
حیثیت سے اس کتاب کے متعلق کوئی رائے نہیں دے سکتا، لیکن ادبیات ولسانیات میں لائق
مصنف کی شہرت سے توقع یہی ہے کہ کتاب اپنے موضوع پر محققانہ ہوگی، مباحث کی کثرت اور
نوعیت سے بھی اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں یہ پہلی جامع کتاب ہے، اور لسانیات کے طلبہ
کے علاوہ جن لوگوں کو اس فن سے دلچسپی ہو ان کے مطالعہ کے لائق ہے،

رفیق حج ۔ از جناب مولانا محمد احتشام الحسن صاحب کاندھلوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت
۱۴۴ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ پتہ: ادارہ
اشاعت دینیات، بستی نظام الدین، دہلی

حج وزیارت کے احکام ومسائل پر اردو میں بہت سی کتابیں ہیں، یہ نئی کتاب مولانا
احتشام الحسن صاحب کی تالیف ہے، اس میں حج کا مقصد، اس کا طریقہ، اس کے متعلق جملہ
فقہی احکام ومسائل، مدینہ طیبہ کی حاضری کے آداب وشرائط، حرمین اور ان کے آثار و

مشاہد کے فضائل، ان کے حالات اور دوسرے متفرق اور مفید معلومات کو جن کا جاننا ایک حاجی کے لیے ضروری ہے، اختصار اور جامعیت کے ساتھ لکھا گیا ہے اور اس لحاظ سے یہ کتاب صحیح معنوں میں رفیق حج ہے، اس کے بعد حج و زیارت کے لیے کسی معلم کی امداد و رہنمائی کی ضرورت نہیں رہتی۔

گلہائے پریشاں۔ مرتبہ جناب الیاس احمد صاحب، ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج تقطیع بڑی ضخامت ۴۸۶ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ؏ پتہ کتابستان الہ آباد۔

لائق مرتب کو شعر و سخن سے خاص ذوق ہے، اور وہ سخن فہمی اور سخن سنجی کا بڑا ستھرا مذاق رکھتے ہیں، اس ذوق کی بنا پر آج سے تقریباً بیس پچیس سال پہلے جب وہ اعظم گڈھ میں منصف تھے، اردو اور فارسی اشعار کا ایک مختصر انتخاب بہار کے نام سے مرتب کرکے شائع کیا تھا، اسکے بعد بھی ان کا یہ شغل برابر جاری رہا، اور بہت سے نئے اشعار جمع ہو گئے، اب انھوں نے اس کو ایک ضخیم مجموعہ کی صورت میں "گلہائے پریشاں" کے نام سے شائع کیا ہے، یہ انتخاب پہلے انتخاب کے مقابلہ میں چوگنا ہے، اس کی ترتیب میں شعراء کی ترتیب زمانی کا لحاظ رکھا گیا ہے، اور اشعار کو مختلف سرخیوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے جس سے یہ سہولت ہو گئی ہے کہ جس قسم کے اشعار مطلوب ہوں، آسانی سے مل جاتے ہیں جس شعر کے متعلق کوئی لطیفہ یا واقعہ ہے، اس کو نقل کر دیا گیا ہے، جس سے اس کا لطف دوبالا ہو گیا ہے، اشعار کے انتخاب کا تعلق زیادہ تر ذوق سے ہے، اس لیے اختلاف مذاق کی بنا پر انتخاب بھی مختلف ہو سکتا ہے لیکن مصنف کا ذوق ستھرا اور پاکیزہ ہے، اس لیے مجموعی حیثیت سے یہ انتخاب دلکش، پسندیدہ اور اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

(م)

نمبر ۵ ماہ ربیع الثانی ۱۳۷۷ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۵۷ء جلد ۸۰

مضامین

شذرات — شاہ معین الدین ندوی — ۳۲۲-۳۲۴

مقالات

ابن الجزری — جناب مولانا محمد عبد العلیم صاحب چشتی فاضل دیوبند — ۳۲۵-۳۴۴

فارابی کی منطق — جناب شبیر احمد خانصاحب غوری ایم اے رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش — ۳۴۵-۳۶۶

فارسی زبان میں صوت شناسی — جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مسلم یونیورسٹی علیگڑھ — ۳۶۷-۳۸۱

ملک الشعراء اختر کا غیر معروف کلام — جناب بشیر الحق صاحب دسنوی — ۳۸۲-۳۹۰

ادبیات

نعت فارسی — جناب کریم الرضا خانصاحب وکیل شاہجہانپور — ۳۹۱

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر — "ض" — ۳۹۲-۳۹۶

مطبوعات جدیدہ — "م" — ۳۹۷-۴۰۰